غلامی اور آزادی کے عبرتناک نظارے

(ایک سندھی شیدی کی داستانِ حیات)

محمد صدیق مسافر

ترجمہ : اسلم خواجہ

دیباچہ

کافی عرصہ میں یہ سمجھتا رہا کہ سندھ کے اپنے ہم ذات شیدی بھائیوں کی دلسوز حالت فقط میرے ہی دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہی ہے تاہم جب مجھے پیارے بھائی جناب غلام حسین صاحب (مرحوم) اسکاوٹ ماسٹر سکنہ کوٹری اور میاں محمد الیاس الہ ڈینو صاحب میونسپل کونسلر ماتلی سے تبادلہ خیال کا موقعہ میسر آیا تو یقین ہوا کہ وہی کرب مجھ سے زیادہ ان صاحبان کے من کو عرصے سے بے حال کر رہا ہے، اس مختصر سی کتاب کا تیار ہونا بھی ان صاحبان کی زوردار فرمائش کی تعمیل ہے۔ ان صاحبان کے قومی اصلاح کیلئے سچا جذبہ اور ہمت دیکھ کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی ہے، اور یہ تسلی بھی ہوئی کہ جس طرح قومی خدمت کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا، اسی طرح انشاء اللہ تعالی فریڈرک ڈگلس اور بوکر ٹی واشنگٹن جیسے کئی ایک دردمند ہم ذات پیدا ہوتے رہیں گے۔

دل چونک شوند بشکنند کوہ را

واللہ الموفق والیہ التوفیق

میرے کئی ایک بزرگ عزیز جن میں سے کچھ اپنے بچپن میں (جیسا کہ میرے والد صاحب) تو کچھ اپنی جوانی میں غلام بن کر سندھ آئے، ان میں سے کچھ نے غلامی کے دل سوز عذاب اپنی جان پر برداشت کئے اور کچھ نے یہ عذاب دیگر ہم ذات غلاموں پر ہوتے ہوئے دیکھے، ان سے حاصل شدہ حقائق اور کچھ انگریزی کتب اور وسائل سے مواد جمع کر کے میں نے یہ کتاب تیار کی ہے۔

گرقبول رفتہ زہی عزوشرف

ٹنڈو باگو

7دسمبر 1950

محمد صدیق مسافر

فہرست

1- حصہ اول: غلامی اور آزادی کے عبرت ناک نظارے..........1

2- باب اول: شیدیوں کی غلامی..........2

3- باب دوئم: شیدیوں کی آزادی کی تاریخ..........7

4- باب سوئم: امریکی شیدیوں کی مکمل آزادی اور فلاح و بہبود..........21

5- باب چہارم: ایام غلامی میں سندھ کے شیدیوں کی حالت زار..........47

6- باب پنجم: آزادی کے ایام میں سندھ کے شیدیوں کی صورتحال..........51

7- باب ششم: سندھ کے شیدیوں کی فلاح و بہبود..........59

8- حصہ دوئم: مسافر کی کہانی۔ خود اسکی اپنی زبانی..........70

9- باب اول: پہلی منزل: والد مرحوم کا بچپن میں سفر..........71

10- باب دوئم: موجودہ مسافر..........77

عہد رفتہ کی مسافتیں

افریقی النسل شیدی برادری کی سندھ میں آمد کے ادوار اور وجوہات پر مختلف آرا پیش کی جاتی ہیں۔ اگرچہ تاحال سندھ کی شیدی برادری پر سائنسی بنیادوں پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تاہم شیدی غلام والدین کے ہاں پیدا ہونے والے محمد صدیق مسافر اس ضمن میں کچھ براہ راست مشاہدات و تجربات آج سے کوئی پچاس برس قبل سندھی میں تحریر کی گئی اپنی سوانح عمری "غلامی ۽ آزادی جا عبرتناک نظارا، ۽ مسافر جی کہانی سندس زبانی" میں شامل کیے ہیں۔ (جس کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے)۔

کئی کتابوں کے مصنف، شاعر، تعلیمی ماہر، صحافی و سماجی امور اور موسیقی کے ماہر سندھی دانشور محمد صدیق مسافر 1879 میں ایک سابق غلام جوڑے کے ہاں جنوبی سندھ کے ایک قصبے ٹنڈو باگو میں پیدا ہوئے۔ انکے والد کو سات برس کی عمر میں زنجبار میں واقع غلاموں کی ایک منڈی میں فروخت کیا گیا تھا، جہاں سے ایک عرب شیخ حسن انہیں مسقط لے آیا۔ حسن نے بچے کو بلاول نام دیکر سندھ کے شہر ٹھٹہ کے ایک سنگ تراش غلام علی کو فروخت کیا۔ ٹنڈو باگو کے ایک زمیندار نے اپنی حویلی کی تعمیر کیلئے غلام علی کی خدمات حاصل کیں تو ٹنڈو باگو کے ایک معزز شخص مخدوم حُر علی نے جب غلام علی کے ہاتھوں بچے کو زدوکوب ہوتے دیکھا تو بچے کو خرید کر اپنے ہاں گھریلو کام کاج پر لگا دیا۔ جب برطانوی انتظامیہ نے ہندستان میں غلامی کے خاتمے کا اعلان کیا تو بلاول نے ایک شیدی خاتون سے شادی کی جو خود اپنے بچپن میں غلام کے طور پر فروخت کی گئی تھی۔

انکے صاحبزادے مسافر نے ٹنڈو باگو میں ایک مقامی زمیندار میر غلام محمد تالپور کے قائم کردہ اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد، انہوں نے ایک پرائمری اسکول میں تدریس کے ساتھ نصابی کتب تحریر کرنا شروع کیں۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے سرگرم حمایتی تھے اور 1919 میں اپنے آبائی قصبے ٹنڈو باگو میں لڑکیوں کا ایک پرائمری اسکول قائم کیا جو بعدازاں ہائی اسکول بن گیا۔ مسافر نے صحافت بھی کی، جس دوران انہوں نے 1901 میں اخبارِ تعلیم اور 1919 میں برھمو سماج نامی جریدوں کی ادارت بھی کی۔ انہوں نے 1935 میں ٹنڈو باگو سے اپنے اخبار "لاڑ گزیٹ" کا اجرا کیا جبکہ بعدازاں کوٹڑی سے اولین شیدی جریدے "الحبش اخبار" جاری کیا۔ مسافر سندھی زبان کے نامور شاعر بھی تھے جن کا ایک مجموعہ کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے دو ناول بھی تحریر کیے تاہم انکی معرکتہ آرا تحریر "غلامی ۽ آزادی جا عبرت ناک نظارا" ہے، سندھی زبان میں تحریر کردہ اس کتاب میں انہوں نے اپنی خاندانی تاریخ کے علاوہ سندھ کی شیدی برادری کی صورتحال اور امریکہ میں سیاہ فام افراد کی تحریک پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

افریقی النسل شیدی برادری کے لاکھوں افراد زیریں سندھ کے باسی ہیں۔ اولاً عرب اور بعدازاں مختلف یورپی تارجران نے انکے اجداد کو غلام بنا کر مسقط اور شطِ العرب کے راستے اور بعدازاں تالپور حکمرانی کے دوران زنجباری یا ممباسائی کہلانے والے تقریباً 600 شیدی غلاموں کو سندھ کی منڈیوں میں فی کس چالیس روپے سے ڈیڑھ سو روپوں میں فروخت کیا گیا۔ نوجوان لڑکیوں کی زیادہ قیمت مقرر کی گئی۔ اُس دور میں لائے گئے غلاموں کے مطابق لامو، پارہ، ماجی اور کینکو پڑ افریقہ میں انکے اہم رہائشی مراکز تھے جبکہ اُن میں سے اکثر کا تعلق ایسے قبائل سے تھا جو تاحال سنٹرل افریقن ریپبلک، ایتھوپیا، سوڈان، تنزانیہ، کینیا، کانگو، انگولا، گھانا، مالی، یوگنڈا اور موزمبیق میں رہائش پذیر ہیں، جن میں سے ملوہ، مڑیما، مڑیما پھانی، توپڑ، یاس، میاسیلینڈا، مزگرا، متوبنی، مکامی، ساگر، مذوئی، ملکوڈنگو، نزلزمیزا، نیامزی، طمالوئی، ظالما اور زانگ سیرگی قابل الذکر ہیں۔

دیگر قدیمی لوگوں کی طرح، شیدی بھی رقص کو سماجی و ثقافتی اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ سندھ کے شیدی کانگو ڈھول کی طرح زمین پر ایستادہ اور درخت کے تنے کی شکل کے افریقی ڈھول مگرمان کے ذریعے اپنی اس روایت پر عمل پیرا ہیں۔ مگرمان کے اوپری حصے پر اونٹ کی کھال منڈھی ہوتی ہے جبکہ اسکو سرخ کپڑے کا پہناوا چڑھایا جاتا ہے۔ اس مقدس آلہ موسیقی کے

احترام میں، اس پر اگربتی اور لوبان کی مقدس سمجھی جانے والی خوشبو کی دھونی دی جاتی ہے۔ رقص کی رسم شروع ہونے سے قبل، مگرمان کو ایک وسیع دائرے کے مرکز میں رکھ کر، اسکی کھال کو سلگتی لکڑیوں سے سینکا جاتا ہے۔ جس کے بعد مرکزی فنکار، ڈھول پر آہنگی سے تھاپ دیتا ہے، جو کہ رقص گاہ کیلئے بلاوہ ہوتا ہے۔ اگرچہ موجودہ دور میں شیدی نغمے بنیادی طور پر سندھی اور اردو زبان میں ہیں تاہم ان میں افریقی زبان سواہلی کے کئی الفاظ شامل ہوتے ہیں جو کہ نوجوان نسل کے شیدی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ نغمے چھن جانے والی ماتر بھومی، غلامی کے کرب اور تنہائی کی شکار زندگی کے المیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایک ایسے ہی نغمے "ماوائی" کے الفاظ ہیں: " کوٹو میری ہے، کوٹو میری ہے۔ " واضح رہے کہ کوٹو نامی نہر تا حال وسطی افریقی جمہوریہ میں رواں دواں ہے۔ کئی ایک سماجی امور کے ماہرین کا خیال ہے کہ سندھ کے شیدیوں کی ایک کثیر تعداد یقیناً ان غلاموں کی نسل سے ہے جو کہ کوٹو کے کناروں سے جبری طور پر سندھ لائے گئے۔

معروف مصنف اور سندھ کی اس محکوم آبادی کے حقیقی دوست خورشید قائم خانی کافی تگ و دو کے بعد سواہلی زبان میں ان موائیوں میں سے کچھ کے تراجم مگرمان بجانے کے نوے سالہ بزرگ ماہر کی مدد سے کر پائے، جن میں سے چند بول کچھ یوں تھے:

"من مانگا منگا نگے
یا مڑو نگے
ڈوما کو جیری۔ یا قسمت
واچوڑی کو بین۔ یا قسمت
ماجی ٹیڑھی۔ ٹیڑی۔ اچکوڑی۔ اچکوڑی"

ترجمہ:

"ہم بچھڑ رہے ہیں
کون جانے پھر کب ملیں
ڈوما! یہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں
او واچوڑی۔ ہماری مدد کر
پانی کے بیچ ہم ساتھ رہیں گے، ساتھ مریں گے۔"

ایک اور موائی یوں تھی

"نزیرا نیچرا ناکا بوکا۔ نایو گوچا
اولو کو یا مڑونگو۔ قیامت موٹو موٹو"

ترجمہ:

"او بھائی! ہم بچھڑ رہے ہیں
مگر مڑنگو کی مدد سے۔ قیامت کے دن پھر ساتھ ہوں گے ہمیشہ کے لئے۔"

صدیق مسافر اپنی کتاب میں ایک شیدی غلام کی بپتا خود اسکی زبانی کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔ "جو عرب جہاز ہمیں زنجبار کی غلام منڈی سے لایا وہ مسقط کی بندرگاہ پر آ کر لنگر انداز ہوا۔ راستے میں جو غلام شدید بیمار پڑ گئے انہیں اُسی حالت میں سمندر میں پھینک دیا گیا۔ ہم بچ جانے والوں کو ایک بڑے سے قلعے میں لایا گیا جہاں ایک بارعب عرب تاجر ریشمی گدوں پر گاؤ تکیے کا سہارا لیکر بیٹھا تھا۔ اس کے حکم پر ہم سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا اور ہمارا طبی معائنہ کیا گیا۔ ہم میں سے جو موٹے تازے تھے انہیں علیحدہ کر کے ایک دوسرے احاطے میں لے جایا گیا، وہاں ان کے ہاتھ پیر باندھ کر ایک قطار میں اکڑوں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد چند جلاد نما ملازم آئے جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں لوہے کی بڑی بڑی بھاری اور تیز دھار والی بھالے نما سلاخیں پکڑ رکھی تھیں۔ پھر ایک ایک کر کے انہوں نے یہ سلاخیں بیٹھے ہوئے غلاموں کے سروں پر اس قوت سے ماریں کہ وہ بدن سے آر پار ہو گئیں اور غلام ان سلاخوں میں سیخ کباب کی طرح پیوست ہو گئے۔"

"احاطے کے ایک کونے میں بڑی بڑی کڑاہیاں آگ پر چڑھے پانی یا تیل سے ابل رہی تھیں۔ غلاموں کو ان ابلتی کڑاہیوں پر کباب کی طرح لٹکا دیا گیا جن کے جسموں سے چربی پگھل کر ان کڑاہیوں میں گرنے لگی۔ اس انسانی چربی سے عرب تاجر قوت باہ کے لئے ایک کشتہ یا

مومیہ تیار کرتے تھے جو سونے کے بھاؤ بکتا تھا اور اس سے وہ بڑا منافع کماتے تھے، جبکہ ان بدنصیب غلاموں کے بچے کھچے گوشت کو بعدازاں دوسرے غلام قیدیوں کو کھلاتے تھے۔ اس طرح انسانی گوشت اور کچھ کھجوریں اور پانی ہماری واحد خوراک تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی رحم دل محافظ کسی خاص صورت میں کسی غلام کو بیمار ظاہر کر کے اسے موت کے منہ سے بچالیتا۔ مگر اس کے فوراً بعد ان زندہ بچ جانے والے غلاموں کو نہلا دھلا کر اچھے کپڑے اور خوشبودار تیل لگا کر غلام منڈی میں لے جا کر فروخت کر دیا جاتا۔"

اسی طرح کا ایک نصیبو نام کا غلام موت کو جُل دیکر اور کئی ہاتھوں میں فروخت ہو کر بالآخر آزاد ہو کر ٹنڈو باگو پہنچا اور وہاں آباد ہوا۔ اُس نے وہاں شادی کی اور اہل وعیال والا ہوا۔ محمد صدیق مسافر کے مطابق اس سابق غلام نصیبو کی تیسری نسل مسافر کی ہم عمر تھی۔

وہ اپنی کتاب میں ایک شیدی غلام خاتون کا قصہ خود اسکی زبانی کچھ اس طرح سے درج کرتے ہیں: "میں جس رئیس کی غلام تھی اسکو اپنے ایک اونٹ سے انتہائی پیار تھا۔ جب اونٹ کو چارہ دینے کا وقت ہوتا تو میرے لئے مالک کا حکم تھا کہ میں اونٹ کا آدھے من کے قریب چارہ سر پر رکھ کر اسکے سامنے کھڑی ہو کر ہی چراؤں تاکہ اونٹ کو چارہ کھاتے ہوئے گردن جھکانے کی زحمت نہیں کرنی پڑے۔ چاہے گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ ہو یا سرما کی ٹھنڈی رات، مجھے ہر روز گھنٹوں یہ عذاب سہنا پڑتا۔"

مسافر کے مطابق اس خاتون کی آل اولاد ٹنڈو باگو کے قریب رہائش پذیر تھی۔

اس سے قبل چارلس نپیئر کی قیادت میں سندھ پر حملہ آور برطانوی فوج کے خلاف ایک معرکے میں وطنِ عزیز پر اپنی جان نچھاور کر کے ہوش محمد عرف ہوشو شیدی نے سندھ کی قومی تاریخ میں ایک قومی سورما کی حیثیت حاصل کی۔

23 مارچ 1843 کو حیدرآباد کے دوآبہ کے میدان میں شہید ہونے والے ہوشو شیدی 1782 کو کلہوڑوں سے سندھ فتح کرنے والے میر فتح علی تالپور کی خانہ زاد غلام اور انکے بیٹے میر صوبدار خان کے ہم عصر تھے۔ یہ ہم عمری بعدازاں گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ اپنے والد میر فتح علی خان کی وفات کے وقت صوبدار خان کم عمر تھے چنانچہ مسندِ اقتدار انکے چچا میر نصیر خان نے سنبھالی۔ صوبدار خان اپنی جوانی کے ایام میں اقتدار سے اپنی محرومی پر کڑھتے ہوئے 1843 میں انگریزوں کی سندھ پر مہم جوئی کے دوران در پردہ انکی معاونت کرنے لگا اور فیصلہ کن میانی کی لڑائی کے دوران حیدرآباد قلعے کے اندر بیٹھ گیا، جس عمل کی ہوشو شیدی نے مخالفت کی اور نتیجتاً قلعہ بدری کا سزاوار قرار دیا گیا۔

اس واقعہ کے چار دن بعد 21 فروری 1843 کو فاتح برطانوی فوج صوبدار خان کے دروازہ کھولنے پر حیدرآباد قلعے میں داخل ہوئی اور صوبدار خان اور میر محمود خان کو حراست میں لیکر خزانہ بالخصوص شاہی خاندان کی خواتین کے زیورات لوٹ لیے۔

ہوشو شیدی کو سندھ کے حکمران خاندان کے ساتھ یہ برتاؤ پسند نہیں آیا اور اپنے بچے کھچے شیدی ساتھیوں کو جمع کر کے انگریزوں سے بدلہ لینے کی غرض سے میرپور خاص چلا گیا جو کہ میر شیر محمد تالپور کی جاگیر تھا۔ ہوشو شیدی کے ہی اصرار پر میر شیر محمد نے 15 مارچ 1843 کو ایک قدرے بڑے لشکر کے ساتھ حیدرآباد کی جانب کوچ کیا تاکہ انگریزوں سے ٹکر لی جا سکے۔ چارلس نپیئر کو اپنے جاسوسوں کی مدد سے اس لشکر کی نقل وحرکت کی اطلاعات ملتی رہیں جن کی بنیاد پر اس نے 23 مارچ کو حیدرآباد سے متصل پھلیلی کے پار دوآبہ کے مقام پر میر شیر محمد کی پیش قدمی روک دی۔ اس وقت نپیئر کی پانچ ہزار سپاہ پر مشتمل فوج میں تھرڈ بمبئی کیولری، پونا پارس اسکوارڈن، ایک پیادہ رجمنٹ اور بارہویں رجمنٹ شامل تھیں۔ صبح سویرے دونوں افواج کا ٹکراؤ ہوا اور کچھ ہی گھنٹوں میں انگریز افواج کے بہتر اسلحے اور تربیت کے سامنے سندھی لشکر کے پاؤں اُکھڑ گئے اور سندھی لشکر پسپا ہونے لگا۔

پسپائی کی اس صورتحال میں ہوشو شیدی نے میر شیر محمد کو مشورہ دیا کہ وہ اُس وقت اپنی فوج کو کسی محفوظ ٹھکانے پر لے جائے اور اگلی صبح تازہ دم ہو کر دوبارہ صف بندی کرے، اس دوران ہوشو شیدی نے اپنے وفادار ساتھیوں کے ہمراہ انگریز فوج کو دوآبہ کے مغربی کنارے پر روکے رکھنے کی ذمہ داری لی۔ ہوشو شیدی کے ساتھی اُس رات دشمن سے لڑتے ہوئے ایک ایک کر کے

شہید ہوتے رہے جبکہ سندھ کی قومی سیاسی تاریخ میں مقبول ہونے والا نعرہ "مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں" (مرتو جائیں گے پر سندھ نہیں دیں گے) بھی سب سے پہلے اُسی رات بُلند ہوا تھا۔ شیدی برادری سے تعلق رکھنے والے یہ سپاہی اس اُمید کے ساتھ شب بھر دشمن سے برسرِ پیکار رہے کہ صبح ہوتے ہی میر شیر محمد کی فوج آ کر انکی جگہ سنبھالے گی تاہم میر شیر محمد تالپور کا یہ سرکاری لشکر اپنے وعدے کے مطابق نہیں پہنچا اور سندھ مکمل طور پر انگریزوں کے سامنے سرنگوں ہوگیا۔

ایک طویل عرصے تک عدم توجہگی کی شکار ہوشو شیدی کی قبر کو کچھ سال قبل شیدی نوجوانوں کی کوشش سے بحال کیا گیا ہے جبکہ اُنکا لگایا گیا نعرہ "مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈیسوں" کچھ عرصہ قبل پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول بھٹو نے زبانِ زد عام کر دیا، جنہوں نے دوآبہ کے مشرقی کنارے پر واقع ہوشو شیدی کی قبر پر حاضری بھی دی۔

1960 کے عشرے میں جہاں ملک بھر میں محنت کش اور کسان طبقات سے نئی قیادت سامنے آئی وہاں شیدی برادری سے تعلق رکھنے والے کامریڈ فیض محمد شیدی نے بھی سندھ بالخصوص حیدرآباد اور گرد و نواح میں ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں اپنی شناخت پیدا کی۔ عزیز سلام بخاری کے ایک چین نواز سوشلسٹ گروپ سے تعلق رکھنے والے کامریڈ فیض محمد انڈس گیس کمپنی (بعد از اں سوئی سدرن گیس کمپنی) کی یونین کے ایک طویل عرصے تک منتخب عہدیدار رہے اور سندھ کے ایماندار ٹریڈ یونین رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے جو کہ اپنے سیاسی نظریات کی بنا پر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرتے رہے۔ کامریڈ فیض محمد کا ایک اہم کارنامہ شیدی برادری سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دلانا تھا جس کے نتیجے میں آج شیدی برادری کی خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد تعلیم حاصل کر کے معاشی اور سیاسی طور پر اپنے پیروں پر کھڑی ہے۔

ماتلی ضلع بدین کی چالیس سالہ تنزیلہ قمبرانی شیدی نے 2018 میں اُس وقت تاریخ رقم کی جب انہوں نے سندھ اسمبلی کیلئے خواتین کی مخصوص نشستوں میں سے ایک کیلئے پاکستان پیپلز پارٹی کی اُمیدوار کے طور پر حلف اُٹھایا۔ روشن خیال وکیل عبدالباری شیدی کی صاحبزادی تنزیلہ اس سے قبل ٹاؤن کمیٹی ماتلی کے چیئرپرسن کے عہدے پر اپنی پارٹی کی اُمیدوار کے طور پر انتخاب میں شکست کھا چکی تھیں۔ تین بچوں کی والدہ تنزیلہ سندھ یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ہیں جبکہ انکی والدہ ریٹائرڈ اسکول ٹیچر ہیں۔ اسلم خواجہ

حصہ اول

غلامی اور آزادی کے عبرت ناک نظارے

باب اول

شیدیوں کی غلامی

رباعی

انسان کو گر کوئی سمجھے حیوان
کیا عقل پر اس کی ہو کوئی ارمان
دولت کے نشے میں چھوڑ دینا رحم دلی کا راستہ
اس سے بڑھ کر مسافر نہیں کوئی اندھیر نگری

غلامی کا رواج دورِ قدیم سے دنیا میں چلا آرہا ہے، دنیا کی کئی ایک اقوام کو کسی نہ کسی زمانے میں غلامی کی ذلت سے گذرنا پڑا ہے، غیر آریاؤں کو آریاؤں نے، ہندوستانیوں، ترکوں اور پٹھانوں کو تاتاریوں نے اور انگریزوں کو رومیوں نے غلامی کے عذاب دیئے ہیں۔ جنگ میں شکست خوردہ قوم کے چھوٹے بڑے بال بچے غلام بنا کر اپنے پاس رکھنے یا خرید وفروخت میں استعمال کرنے کا تو رواج دنیا کی تمام تر اقوام میں عام وطیرہ تھا۔ ہر ایک قوم کی داستان تاریخ میں موجود ہے، تاہم یہاں ہمیں فقط شیدیوں کی غلامی کا دردناک احوال تحریر کرنا ہے۔ مصر اور مصر کے ساتھ شمالی پٹی کے علاوہ پورا براعظم افریقہ شیدیوں کا قدیم اور قدرت کی جانب سے ملا ہوا ایک آستانہ تھا اور ہے۔ شیدیوں کو غلام بنا کر فروخت کرنے کی ابتداء عربستان کے تاجروں نے عیسوی سن کی ابتداء سے بھی پہلے کی۔ حضرت موسیٰ جب مصر کے بادشاہ فرعون کے پاس خدائی پیغام لے کر آئے تو اپنے ایمان کی قوت اور خدائی مدد کے ساتھ فرعون کو مات دیکر اپنے ہم ذات (بنی اسرائیل کے لوگ) جو مصریوں کے پاس غلام تھے، کو غلامی سے نجات دلا کر مصر لے گئے۔ مصریوں نے اس کے بعد بنی اسرائیل غلاموں کی جگہ شیدیوں کو غلام کے طور پر لینا شروع کیا، بعدازاں عربوں نے ان کی پیروی کی۔ شیدیوں کی

غلامی سے مصریوں اور عربوں کو ذیل درج فوائد تھے۔

1: جس طرح گدھوں، گھوڑوں اور دیگر جانوروں کی تجارت سے دولت کماتے تھے اسی طرح شیدیوں کی خرید وفروخت سے بھی انہیں دولت حاصل ہونے لگی۔ جانوروں کی خرید پر زیادہ پیسے صرف ہوتے تھے جبکہ شیدی غلام حاصل کرنے پر اخراجات کم آتے تھے۔

2: جو شخص غلام خرید کر اپنے پاس رکھتا تھا وہ نوکر چاکر رکھنے کے اخراجات سے ہمیشہ کیلئے بچ جاتا تھا۔

3: دوافروش تاجر، ایک انتہائی قیمتی دوا کے اجزاء شیدیوں کے جسم سے حاصل کرتے تھے۔

4: میدان جنگ میں سپاہی بنا کر صف اول میں لڑانے کے لئے شیدی خرید کیے جاتے تھے۔

5: میدان جنگ میں سپاہیوں کی خدمت گزاری اور دیگر کام کاج کے لئے یہ شیدی کام کرتے تھے۔

یہ تاجر شیدیوں کو کیسے حاصل کرتے تھے۔ افریقہ میں کئی ایک ذاتیں ہیں جو کہ ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑے کرتی تھیں، ایسی لڑائیوں کے دوران فتح یاب ذات کے افراد شکست خوردہ ذات کے تمام مرد وخواتین کو اپنی تحویل میں لے کر ساحل سمندر پر لے آتے تھے، مصری اور عرب تاجر وہاں خیمہ زن ہو کر اپنی کشتیاں تیار رکھتے تھے، اور معمولی سی رقم کی ادائیگی کے بعد تحویل میں افراد کے ہجوم اپنی کشتیوں پر سوار کر کے روانہ ہو جاتے تھے۔

تاجروں کے پاس شیدیوں کو لے جانے کا ایک اور طریقہ بھی تھا۔ وہ پہلے تو ساحل کے قریب رہنے والے بھولے بھالے شیدیوں کو کھانے پینے کی لذیذ اشیاء پیش کر کے ان کے ساتھ تعلقات استوار کرتے تھے اور جب وہ انکے دام میں پھنس کر ان نایاب چیزوں کے دھوکے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کشتیوں پر سوار ہوتے تو جھٹ پٹے کے وقت تاجر بادبان کھول کر کھلے سمندر میں روانہ ہو جاتے۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ جب عرب تاجر کسی شیدی سردار کو کسی من پسند چیز پر للچاتے تو اس چیز کے معاوضے میں شیدی طلب کرتے، سردار کسی شیدی خاندان کے کچھ افراد پر الزام عائد کرتا کہ تم لوگوں نے میرے فلاں فلاں لوگوں پر کوئی جادوٹونہ کیا ہے، الزام دھرا شخص خود پر عائد الزام پر روایت کے مطابق زہر کا پیالہ پیتا اور زہر خوانی کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے شخص کو جادوٹونہ کرنے کا مرتکب

سمجھا جاتا اور جرمانے کے طور پر اس کے خاندان کے افراد عرب تاجر کے حوالے ہو جاتے ۔ بعض اوقات عرب تاجر اسلحے کے زور پر شیدیوں کو زبردستی کشتیوں پر سوار کرا دیتے تھے ۔
کشتیوں پر غلاموں کو بوریوں کی طرح بھرا جاتا تھا جس کے نتیجے میں کئی ایک ہلاک ہو جاتے ، جبکہ کئی دیگر جان لیوا بیماریوں کا شکار ہو جاتے ، سنگدل سوداگر بیمار غلاموں کو سمندر میں پھینک دیتے تھے ۔

دوران سفر اگر کسی طوفان وغیرہ کی زد میں آنے کی وجہ سے کشتیوں سے وزن کم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو غلاموں پر ہی مصیبت آتی اور ان کی ایک تعداد کو سمندر برد کر دیا جاتا ۔
یہ غلامی میں گرفتار ہونے کی جو صورتحال بیان کی گئی ہے وہ افریقہ کے مشرقی ساحل اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام تر علاقوں کے رہائش پذیر شیدیوں سے لاحق تھی ۔ پورے براعظم ایشیاء میں شیدیوں کی جو بھی خرید و فروخت ہوتی وہ تمام تر عرب تاجروں کے ہاتھوں ہوتی تھی ، سندھ میں بھی جو شیدی فروخت ہو کر پہنچتے وہ عربوں اور پٹھانوں کے لائے ہوئے تھے ۔ میں نے آزادگی کے دور میں کئی ایک بزرگ شیدی دیکھے جن سے غلامی کی تکالیف کی داستانیں سن کر رواں رواں کانپ جاتا تھا ۔ ان میں سے اکثر کا کہنا تھا کہ وہ چنگبار سے لائے گئے ہیں ، چنگبار افریقہ کا وہ حصہ ہے جو آج کل کی جغرافیہ میں زنجبار کہلاتا ہے ۔
یورپی اقوام ایک عرصے کے بعد شیدیوں کی تجارت میں ملوث ہوئی ہیں ۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں پرتگالیوں کو زنجبار اور اس سے ملحقہ جزائر ہاتھ آئے وہاں کی زرخیز زمین دیکھ کر انہوں نے وہاں گنے اور اناج کی کاشت شروع کی اور فیکٹریاں قائم کیں ۔ پرتگال میں اتنے مال مویشی تھے ہی نہیں کہ ویران نو آبادیوں میں کاشت کاری ہو سکے ، ہل جوتیں اور باربرداری کریں اس لئے ان لالچی پرتگالیوں نے وہاں کے اصل باشندوں بھولے بھالے ریڈ انڈینز کو غلام بنا کر ان سے جانوروں کا کام لینا شروع کیا ۔ امریکی بیچارے کمزور اور ناتواں تھے اس لئے ان کی زیادہ تر تعداد کام کاج کی سختی اور پرتگالیوں کی بے رحمی کے باعث جلد ہلاک ہو جاتی ۔
عرب اپنے دور عروج میں پرتگال کے قریب اسپین میں حکومت کر چکے تھے ، چنانچہ پرتگالیوں کو

عربوں کے ساتھ دیکھے ہوئے مضبوط شیدی غلام یاد آگئے ۔ پرتگالیوں نے بعد ازاں افریقہ کے مغربی ساحل کے کچھ حصوں پر قبضہ کیا اور شیدی غلام حاصل کرنا شروع کر دیئے ۔ پرتگالیوں کے علاوہ دیگر جن اقوام نے امریکہ یا دیگر مقامات پر نئی مقبوضات کیں ، انہوں نے بھی اپنے کھیتوں اور کارخانوں میں جانوروں کی جگہ تمام کام کاج شیدی غلاموں سے ہی حاصل کیے ۔
یورپی تاجروں نے شیدیوں کو غلام بنانے کے لئے وہی راستے اختیار کئے جو مشرقی ساحل پر عرب تاجروں کے زیر مصرف تھے ۔ یورپ کے باسیوں نے اس ضمن میں مزید یہ کیا کہ رات گئے بھی بندوق اور بارود کے بل بوتے پر شیدیوں کے کسی گاؤں دیہات پر حملہ بھی کرتے ، کچھ شیدی مقابلے میں مارے جاتے باقی تمام چھوٹے بڑے عورتوں بچوں کو ھنکال کر جہاز تک لایا جاتا ۔
بعض اوقات وہ رات کے اندھیرے میں شیدیوں کے دو چار قریبی دیہات کو آگ لگا دیتے ، گہری نیند میں سوئے ہوئے لوگ گھبرا کر جاگ جاتے اور اپنے خاندانوں کے ساتھ گاؤں سے بھاگنے لگتے تو چھپے ہوئے تجارتی کارندے انہیں گھیر کر جہازوں تک لاتے ۔ یورپی تاجروں نے 1517 میں شیدیوں کی تجارت شروع کی انہیں اس کام کی ایسی لت لگی کہ 1680 اور 1700 کے درمیان تین لاکھ شیدی جبکہ 1700 اور 1786 کے دوران فقط جزیرہ نما جمیکا میں چھ لاکھ دس ہزار شیدی لائے گئے ۔ ساحل سے دور علاقوں سے جب پکڑے گئے شیدیوں کے قافلے پیدل جہازوں تک لائے جاتے تھے تو راستے بھر جگہ جگہ شیدیوں کی لاشیں نظر آتی تھیں ، کچھ سفر کی تھکاوٹ کے باعث تو کچھ بھوک اور پیاس کے مارے گئے ہوتے تو کچھ اور مقابلے کی صورت میں گولیوں کا نشانہ بن کر اپنی زندگیاں گنوائے ہوئے تھے ۔ جہازوں میں ان شیدیوں کے ساتھ بھی وہی زیادتیاں ہوتی تھیں جو مشرقی ساحل کے شیدیوں کے ساتھ روا رکھی جاتی تھی ۔ جس طرح آجکل بھیڑ بکریوں کے تاجر ریوڑ ہانک کر کسی بڑے شہر کی منڈی میں آتے ہیں اور قصاب اور خریدار ہر جانور کو بغور معائنے کے بعد معاوضے پر خریدتے ہیں اسی طرح ہر بڑے شہر کی مارکیٹ میں بے قصور اور معصوم شیدیوں کے ہجوم لا کر کھڑے کیے جاتے تھے ، ہر ایک کو اپنا تن ڈھانپنے کے لئے ایک انگوچھا دیا جاتا تھا ، باقی پورا جسم ننگا رکھا جاتا تھا ، چاہے گرمی ہو یا سردی ۔ خریدار جانچتا کہ

کہیں کوئی جسمانی نقص یا کوئی مرض نہ ہو۔خریداری کے بعد خریدار ہی مالک ہوتا، چاہے تو کسی جانور کی طرح کوڑا استعمال کرے یا جان سے ہی مار دے نا کوئی داد نہ کوئی فریاد۔

قیامت کے عذاب میں بھی رحم کی امید رکھی جاتی ہے لیکن بیچارے شیدیوں نے ایسی قیامت بھگتی ہے کہ جس میں رحم کے تمام تر دروازے ان پر بند ہی تھے۔

باب دوئم

شیدیوں کی آزادی کی تاریخ

سب سے پہلے خدا تعالی کے جس نیک اور پیارے انسان نے شیدی غلاموں کی حالت زار پر رحم کیا اوران کی آزادی کے لئے خلق خدا کو ہدایت کی وہ بانی اسلام حضرت پیغمبر کریم ﷺ تھے۔ براعظم ایشیاء میں شیدی غلاموں کی تجارت کی باگ دوڑ عرب تاجروں کے ہاتھ میں تھی اس لئے خدا تعالی نے عربستان سے ہی غلاموں کی ہمدردی کی صدا بلند کرائی۔

قرآن شریف میں بے رحم اور مغرور دولت مند افراد کو ہدایت کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ درست ہے کہ ہم نے انسان کو محنت کی خاطر تخلیق کیا ہے (مغرور دولت مند) انسان یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی اور طاقت ان پر غالب نہیں آسکتی وہ فخر یہ طور پر یہ کہتے ہیں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے وہ دولت کے انبار خرچ کر سکتے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے اعمال ہی کسی طاقت کی نظر میں ہیں اس کو دو آنکھیں، زبان اور ہونٹ نہیں دیئے گئے ہیں، کیا؟ ان کے سامنے نیکی اور بدی دونوں راستے واضع کر دیئے گئے ہیں اس کے باوجود بھی وہ خود کو آخرت کے عذاب سے محفوظ نہیں بنا سکے ہیں، تمھیں معلوم ہے کہ آخرت کے عذاب سے خود کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ کیا ہے، غلاموں کو آزاد کرنا، قحط کے دنوں میں عزیزوں اور یتیموں اور کنگال مساکین کی شکم سیری کرنا۔ یہ ہے کہ آخرت کے عذاب سے نجات کا راستہ جو ایمان والے انسان ہیں وہ صبر کرنے والے اور رحم وبرکت والے انسان ہیں (سورۃ البلا پارہ عم) قرآن شریف نے عجیب اور پر اثر پیرائے میں غلاموں کی آزادگی کی ہدایت کی ہے۔

کلام پاک میں ایک اور جگہ فرمایا گیا کہ جو تمیز دار غلام اور کنیزیں ہوں ان کی آپس میں شرعی دستور کے تحت شادیاں کراؤ، اگر وہ کنگال ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں باثمر بنائے گا اللہ تعالیٰ کشادہ

گزر بسر دینے اور تمام تر حال جاننے والا ہے۔ جو غلام اپنی قیمت کی رقم آزادانہ طور سے محنت مشقت کر کے یا خیرات کے طور پر حاصل کر کے تمھیں ادا کرنے کے لئے تحریری وعدہ کریں ان کے ایسے وعدے قبول کرو تمھیں اللہ تعالیٰ نے جو دولت اور مایا بخشی ہے اس میں سے ایسے وعدے تحریر کر کے دینے والے غلاموں کو خوب خیرات دو پھر وہ خود کو جلد از جلد آزاد کروا سکیں (سورۃ النور پارہ قد الفلاح) عربستان میں امیر لوگ غریب لوگوں سے فاصلہ رکھ کر رہتے تھے کہ کسی غریب کے ساتھ راہ چلتے ہوئے فقط کندھا یا کپڑا مس نہ کر سکیں، اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ غریب غلاموں کے ساتھ امیر لوگ کس طرح کا برتاؤ کرتے ہونگے۔ پھر جب کلام اللہ میں حکم آیا کہ اے انسانوں ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، تمھاری قومیں اور قبیلے اس لئے بنائے ہیں کہ ایک دوسرے کو آسانی کے ساتھ شناخت کر سکو لیکن اللہ تعالیٰ کے پاس تم میں سے وہی بہتر انسان ہے جو اس کا زیادہ خوف رکھتا ہے (سورۃ الحجراۃ پارہ عم) اس وقت سے غریب مسلمان غلام بڑے امیر کبیر لوگوں کے ساتھ کندھا جوڑ کر عبادت کرنے لگے، مجالس میں امیروں کے برابر نشست پر بیٹھنے لگے۔

حضرت پیغمبر کریم ﷺ نے اپنے روزمرہ کے معمولات میں غریب غلاموں پر رحم کھانے اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنے سے متعلق کئی ایک احادیث شریف فرمائیں مثلاً:

1: حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے بھائیوں یعنی آپ جیسے انسانوں کو آپ کے بس میں لائے ہیں، آپ میں سے جس کے پاس بھی اپنے جیسا غلام ہو تو اسے چاہیے کہ جیسا خود کھائے پیئے ویسا ہی غلام کو کھلائے پلائے اور جس طرح کے کپڑوں سے اپنا جسم ڈھانپے اسی طرح غلام کے پہناوے کا بندوبست کرے اور غلاموں سے ایسا کوئی کام نہ لے جو ان کی جسمانی استقاط سے زیادہ ہو (صحیح بخاری اور صحیح مسلم)

2: ابومسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ میں اپنے ایک غلام کو پیٹ رہا تھا کہ عقب سے آواز آئی اے ابو مسعود! جس قدر تم اس غلام پر غالب ہو اس سے کہیں زیادہ خدا تم پر غالب ہے۔ یہ سن کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو حضرت نبی اکرم ﷺ یہ کہتے ہوئے میری طرف آرہے تھے، میں نے ادب سے

عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اس غلام کو آزاد کرتا ہوں تو آپ فرمانے لگے کہ اے ابومسعود اگر ایسا نہیں کرتے تو دوزخ کی آگ میں جلائے جاتے (صحیح مسلم)

3: حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ فرماتے تھے کہ تمھارے جو غلام اور کنیزیں فرمانبردار ہوں انہیں اپنے جیسا کھلاؤ پلاؤ اور اپنے جیسا برتاؤ کرو اور جو فرمانبردار نہ ہوں انہیں اذیت نہ دو بلکہ ان کو فروخت کر دو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بے بس مخلوق کو تکلیف پہنچانا مناسب نہیں ہے (مشکواۃ شریف)

4: حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ حضرت مسلم ﷺ فرماتے تھے کہ کسی غلام کو مارتے وقت اگر اسکی زبان سے اللہ تعالیٰ کا نام ادا ہو تو فوراً اپنے ہاتھ روک دو (ترمذی)

حضرت نبی کریم ﷺ غلاموں سے ہمدردی اور رحم کے لئے دوسروں کو تاکید کرتے ہی تھے لیکن خود بھی عملی طور پر ہمدردی اور رحم دلی کا مظاہرہ کرتے تھے، وہ اپنے غلاموں کو آزاد کر کے ان کے ساتھ اپنی اولاد جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ حضرے زید بن حارثؓ جوان کے غلام تھے کو آزاد کر کے اپنا لے پالک بنایا اور ان کا اپنی سگی پھوپھی زاد بہن بی بی زینب بنت جحش سے بیاہ کروایا اسی زیدؓ کو جنگ موتہ میں اسلامی لشکر کا سپہ سالار بھی بنایا جس کے نیچے تمام امیر زادے عربوں نے سپاہیوں کے فرائض انجام دیئے۔ حضرت زیدؓ کے نوجوان بیٹے اسامہ رضا کو جنگ انہی کی فوج کا سپہ سالار بنایا، یہ سپہ سالاری حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دور خلافت میں بھی برقرار رکھی۔

حضرت نبی اکرم ﷺ کی قیمتی ہدایات اور عملی کارروائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ عربوں نے غلام بنانا چھوڑ دیئے اور ہزاروں امیر مسلمان آخرت کے ثواب کے لئے اپنے زرخرید غلام اور کنیزیں آزاد کرنے لگے۔ کئی ایک امیر لوگ کسی غلام کو اپنے مالک کے پاس تکلیف میں دیکھتے تو رقم کی ادائیگی کے بعد اسے آزاد کرا دیتے جن کے پاس غلام ہوتے وہ بھی ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے لگے۔ اسلام کے دنیا میں پھیلنے کے ساتھ غلاموں کی آزادگی اور ہمدردی کا یہ سلسلہ بھی بڑھتا گیا۔

انسان ذات کے ساتھ عالمگیر ہمدردی کا جو سبق اسلام نے سکھایا تھا وہ بعد ازاں کچھ شعراء نے اپنے انداز میں بھی بیان کیا۔

جیسا کہ:

الناس من جھۃ التمثال اکفا
ابوھم آدمؑ والاحوا
(جنس کے طور پر تمام انسان ایک سے ہیں
کہ سب کا باپ آدمؑ اور ماں ہے حوا)
بہ نسب آدمیاں یکہ تفاخر ورزند،
از رہ دانش وانصاف چہ دور افتادند
زرسد فخر کہ راز نسب بروگری
چونکہ دراصل ز یک آدمؑ وحوا زادند
(کاشفی)
(جو لوگ اپنے حسب نسب پر فخر کرتے ہیں
وہ دانش وانصاف کی راہ سے کتنا دور نکل گئے ہیں!
کسی انسان کو حسب نسب پر گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے
کیونکہ بنیاد میں سب آدمؑ وحوا کے جائے ہیں)
بنی آدم اعضا یکدیگرند،
کہ درآفرینش ز یک جوہرند،
چون عضوے بدرد آورد روزگار،
گر عضوھا را نماند قرار،
(سعدی)
(تمام انسان ایک دوسرے کے عضو ہیں
کیونکہ انکی پیدائش کا بیج ایک ہی ہے
گر کسی ایک عضو کو زمانے کی ٹھوکر لگے گی

تو باقی کو بھی آرام نصیب نہیں ہوگا)
بشنو زمن نکتہ رے زندہ دل،
وز پس مرگم بہ نیکی یاد کن،
کہ بلطف آزاد کند بندہ مسان،
کہ بہ احسان بندہ آزاد کن،
(کاشفی)
(اے بیدار دل انسان! میری بات من میں سینچو
امید کہ میرے بعد از مرگ مجھے نیک نامی سے یاد کرو گے
بات یہ ہے کہ کبھی بھی آزادی کے حقدار کو غلام نہ بناؤ
اور کبھی احسان کر کے غلام کو کر آزاد)

ایشیاء میں بسنے والے پردیسی شیدی غلاموں کے لئے اسلام نے انتہائی اعلیٰ درجے کی رحم دلی اور ہمدردی پیدا کردی تاہم امریکہ کے شیدی غلاموں سے غلامی کا عذاب ختم کرتے اور پوری دنیا سے غلاموں کی تجارت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا انعام خداتعالیٰ نے بالآخر انگریزوں کو نصیب کیا۔

یورپی تاجروں نے شیدی غلاموں کی تجارت 1517 سے شروع کی، اس کے کوئی ڈھائی سو سال بعد برطانیہ میں غلاموں کی آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ انگریز زمیندار اور تاجر جو امریکہ میں رہتے تھے اپنے وطن برطانیہ آتے ہوئے اپنے شیدی غلام بھی ساتھ لاتے تھے، وہاں یہ امیر لوگ اپنے غلاموں کے ساتھ من چاہا برتاؤ کرتے کیونکہ ان کی باز پرس کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

1710 میں ایک انگریز امیر شخص نے اپنے شیدی غلام کو شدید مار پیٹ کر کے دم مرگ حالت میں لندن کی کسی گلی میں پھینک دیا۔

الف۔ مسٹر گرینویل شارپ:

ایک رحم دل شخص مسٹر گرینویل شارپ نے جن کے بھائی ایک بہت بڑے ڈاکٹر تھے

نے اس لاوارث غلام کو دم مرگ دیکھا تو نہ صرف افسوس کا اظہار کیا بلکہ اسے لے جا کر اپنے بھائی کے ہسپتال میں داخل کرایا جب یہ مریض جس کا نام جواذن مسٹرانگ تھا صحت مند ہو گیا تو لندن شہر میں آزادی کے ساتھ محنت مشقت کر کے اپنی زندگی گزارنے لگا۔

دو برس کے بعد مسٹرانگ کو اس کے اصل مالک نے لندن کے کسی چوراہے پر دیکھ لیا اور وہیں اس کو پکڑ کر تیس پاؤنڈ میں فروخت کر دیا۔ کسی بحری جہاز کی ویسٹ انڈیز روانگی تک مسٹرانگ کو اس کے نئے خریدار نے فنڈ میں رکھوایا۔ مسٹر گرینویل شارپ کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فوراً لندن کے لارڈ میئر سے رابطہ کیا جنہوں نے حکم صادر کیا کہ چونکہ مسٹرانگ کو کسی وارنٹ کے بغیر لندن شہر سے گرفتار کیا گیا ہے چنانچہ انہیں فوراً رہا کیا جائے۔ مسٹرانگ آزاد تو ہو گیا لیکن اس کے نئے خریدار اور مسٹر گرینویل شارپ کے درمیان ایک طویل قانونی تنازعہ کھڑا ہو گیا جس میں بالآخر مسٹر گرینویل شارپ کامیاب ہوئے اور مسٹرانگ کو ہمیشہ کے لئے آزادی نصیب ہوئی۔

مسٹر گرینویل شارپ پہلے نیک دل اور خدا ترس انگریز تھے جو بے بس غلاموں کی مدد کے لیے لندن میں اذن مسٹرانگ کے مقدمے کے بعد غلاموں کی مدد کے کاموں میں سرگرم ہو گئے۔ اس وقت عام لوگوں کا خیال تھا کہ ایک مرتبہ غلام بننے والا ہمیشہ کے لئے غلام ہی ہو گا۔ مسٹر گرینویل شارپ نے اس دور کے نامور وکلاء ٹبلاٹ اور پارک وغیرہ سے مشاورت کی لیکن کوئی بھی وکیل ان کا ہم خیال نہیں بن سکا سوا انہوں نے خود قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

مسٹر گرینویل شارپ نے سب سے پہلے برطانیہ کے تمام پرانے قوانین کو کھنگالا اور دو سال کے مطالعے اور عرق ریزی کے بعد انہوں نے ایک اعلامیہ جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ رب العزت کی شکر گزاری کہ ایسا کوئی انگریزی قانون نہیں ہے جس کے مطابق کسی انسان کو غلام بنانا انصاف کے عین مطابق ہو۔

اس کے بعد انہوں نے ایک کتاب بعنوان برطانیہ میں جاری غلاموں سے متعلق ناانصافی تحریر کی۔ اس کتاب میں وکلاء کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ انہوں نے اس کتاب کی کاپیاں تمام وکلاء اور اخبارات کے مدیران کو ارسال کیں جبکہ یہ تمام لوگوں کی دسترس کے لئے بھی میسر کی۔ اس کتاب

کی اشاعت کے بعد پورے برطانیہ میں غلاموں کی حالت زار پر توجہ مبذول کرانا ایک نیا قابل تشویش مسئلہ بن گیا۔ مسٹر گرینویل شارپ کو ہر جگہ بے کس غلاموں کا دوست کہا جانے لگا۔

مسٹر گرینویل شارپ قید خانوں اور غریب بستیوں کا دورہ کرتے اور بندرگاہوں پر لنگر انداز جہازوں کا معائنہ کرتے۔ ان کی کھولیوں میں اگر کوئی بے بس شیدی غلام نظر آتا تو عدالت کے ذریعے اس کے آزادی کا اہتمام کرتے۔ ایک بڑے انگریز تاجر نے اپنے شیدی غلام سمرسیٹ کے ساتھ لندن میں انتہائی بے رحمانہ برتاؤ کیا کیونکہ وہ جمیکا واپس جانے سے انکاری تھا۔ امیر تاجر نے سمرسیٹ کو رسیوں سے باندھ کر جمیکا جانے والے ایک بحری جہاز کی کھولی میں بند کر دیا تاہم مسٹر گرینویل شارپ جہاز کی روانگی سے قبل وہاں پہنچ گئے اور انتہائی تگ و دو کے بعد سمرسیٹ کو جہاز سے اتارا گیا اور مقدمہ عدالت کے سامنے پیش ہوا۔ سخت دلائل کے بعد بارہ ججوں نے متفقہ فیصلہ صادر کیا کہ جو بھی غلام برطانیہ کی سرزمین پر پیر رکھے گا وہ آزاد تصور کیا جائے گا بعد ازاں 1722 میں یہ فیصلہ برطانیہ میں ایک مستقل قانون کی شکل اختیار کر گیا۔ اس فتح نے مسٹر گرینویل شارپ کی ہمت کو ایک نیا حوصلہ بخش دیا اب وہ برطانیہ سے باہر پہنچ کر غلاموں کی فکر کرنے لگے۔

اپنے طور پر مسٹر گرینویل شارپ بہت زیادہ امیر کبیر شخص نہیں تھے لیکن اپنے کچھ دولت مند رشتہ داروں کے انتقال کے بعد ترکے میں ملنے والی دولت سے وہ خاصے امیر ہو گئے جس سے وہ فراخ دلی کے ساتھ غلاموں کی مدد کرنے لگے۔ کئی ایک تعلیم یافتہ اور بااثر خواتین و مرد بھی مسٹر گرینویل شارپ کے مقصد میں شامل ہو گئے جن میں سے مسٹر تھامس کلارکسن، ولیم ولبر فورس اور سر تھامس فاؤویل بکسٹن اہم ہیں۔

1783 میں پہلی اینٹی سلیوری کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے رائے عامہ ہموار کرنے میں انتہائی محنت کی۔ مسٹر گرینویل شارپ 13 1813 میں تہتر برس کی عمر میں انتقال کر گئے لیکن آنکھیں موندتے سمے ان کی روح خوشی اور اطمینان سے یقیناً سرشار ہو گی کہ وہ اپنے ادھورے مشن کی تکمیل کے لئے کئی ایک باہمت اور باشعور افراد کو اپنے اردگرد چھوڑ کر جا رہے تھے۔

ب۔ تھامس کلارکسن:

تھامس کلارکسن کیمبرج علاقے کے گاؤں وزبیچ میں 1760 میں پیدا ہوئے ،ان کے والد مقامی فری گرامر اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔تھامس کلارکسن کے سینٹ جانسن کالج کیمبرج میں بی اے کرنے کے دوران کیمبرج یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر پیکرڈ نے طالب علموں کو لاطینی زبان میں ایک انعامی مضمون تحریر کرنے کو کہا جس کا عنوان تھا کیا کسی بھی انسان کو اس کی مرضی کے برعکس غلام بنانا درست ہے۔

تھامس کلارکسن نے اپنے مضمون کی تیاری کے سلسلے میں باقی تمام طلبہ سے زیادہ محنت کی اور غلامی سے متعلق کئی مضامین کا مطالعہ کیا۔ان کے مضمون کو اول نمبر قرار دیا گیا اور یونیورسٹی سینیٹ میں پڑھنے کے علاوہ اسے انعام کا حقدار بھی قرار دیا گیا۔

اس وقت سے غلامی سے نجات کی خواہش اس نوجوان کے دل میں رچ بس گئی۔پچیس برس کی عمر میں تھامس کلارکسن جب لندن منتقل ہوئے تو اپنے اس مضمون کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ کلارکسن کے اس مضمون نے انتہائی مقبولیت حاصل کی اور اس طرح وہ اینٹی سلیوری کمیٹی کے ارکان کی آنکھ کا تارا بن گئے۔

کلارکسن کی شمولیت کے بعد مسٹر گرینویل شارپ نے 1788 میں اینٹی سلیوری کمیٹی کو نئے سرے سے فعال کیا۔کلارکسن اس کمیٹی کے روح رواں بن گئے اور ولیم ولبرفورس کے پارلیمنٹ کے رکن ہونے کی وجہ سے کمیٹی کے جہاز کو گویا ایک قابل اعتماد ناخدا مل گیا۔

کلارکسن نے غلاموں کی تجارت کے تفصیل جمع کرنے کا کام جاری رکھا اور جو بھی انگریز تاجر یا سیاح افریقہ یا ویسٹ انڈیز سے آتا تو اس سے حقائق معلوم کرتے۔ جو جہاز غلاموں کی تجارت میں مصروف عمل ہوتے ،ان پر سوار ہو کر نامناسب کھولیوں کا معائنہ کرتے جن میں غلاموں کو رکھا جاتا تھا۔انہوں نے بیشتر اہم بندرگاہوں کا دورہ کیا جو غلام فروخت کرنے والے جہازوں کے لنگر انداز ہونے کا بندوبست کرتے تھے۔

انکی سات برس کی تگ و دو نے غلاموں کے تاجروں کو بھی پریشان کر دیا اور وہ کلارکسن پر طرح

طرح کے الزامات عائد کرنے لگے۔ان پر کچھ قاتلانہ حملے بھی ہوئے تاہم وہ محفوظ رہے۔دوسری جانب ولیم ولبرفورس نے پارلیمنٹ میں غلاموں سے متعلق ہمدردی پیدا کرنے کی غرض سے اچھا خاصہ ادھم مچا رکھا تھا۔

1807 میں غلاموں کی تجارت پر پابندی سے متعلق پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا بل حکومت نے منظور کر لیا تاہم بل پر مکمل عمل درآمد کے سلسلے میں دسیوں مسائل برقرار رہے۔کلارکسن نے ایک کتاب غلام فروشی بند ہونے کی ضرورت سے متعلق خیالات تحریر کی ،جس میں ثابت کیا گیا کہ غلام فروشی مسیحیت اور برطانوی قوانین کے خلاف ہے۔ غلام فروشی غلاموں اور غلام فروشوں دونوں کے حق میں نقصان دہ ہے،آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

دنیا بھر میں غلام فروشی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے 1840 میں لندن میں ایک اینٹی سلیوری کنونشن منعقد کیا گیا جس کے صدر نشین تھامس کلارکسن تھے انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا کہ میں ایمانداری سے کہہ سکتا ہوں کہ میری جسمانی طاقت روز بروز کم ہوتی جارہی ہے تاہم میرا دل اکیاسی برس کی عمر میں بھی اس فلاحی کام کیلئے اسی گرم جوشی سے دھڑک رہا ہے جیسا کہ چوبیس برس کی عمر میں تڑپا تھا،جب میں نے اس مقدس کام میں پہلا قدم اٹھایا تھا۔میں اپنی پوری ایمانداری سے کہتا ہوں کہ اگر مجھے نئی زندگی مل جائے تو وہ بھی اسی کام میں صرف کردونگا۔ تھامس کلارکسن لگ بھگ تینتالیس برس غلام فروشی ختم کرانے کی جدوجہد میں مصروف رہے وہ 1846 میں ستاسی برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

ث۔ ولیم ولبرفورس:

ولیم ولبرفورس 1759 میں برطانوی شہر ہل میں ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے۔بچپن میں نازک اندام جسم کے مالک ولیم زبان کے ایسے فصیح تھے کہ سات برس کی عمر میں جب وہ ہل کے گرامر اسکول کے طالب علم تھے تو اساتذہ انہیں میز پر کھڑا کر کے پوری کلاس کو ولیم کے طرز پر پڑھنے کا حکم دیتے۔

وہ ابھی نو برس کے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنے چچا کے پاس لندن میں رہنے

لگے۔ان کی چچی انتہائی دیندار خاتون تھیں جنہوں نے ولیم کو مذہبی رنگ میں رنگ دیا۔ولیم بائبل کا ایسی خوب ترانی سے ورد کرتے کہ سامعین محو ہو جاتے۔ چودہ برس کی عمر میں ولیم نے اخبار میں ایک مضمون بعنوان، انسانی ماس کی قابل نفرت تجارت سے متعلق شکایات تحریر کیا، جو کہ غلاموں کی تجارت کرنے والوں کے لئے گویا زہر میں ڈوبا ہوا ایک نشتر تھا۔ سترہ برس کی عمر میں ولیم ولبر کیمبرج کالج میں داخل ہوئے جہاں ان کے ایک کلاس فیلو ولیم پٹ بھی تھے جن کے ساتھ ان کی دوستی تادم مرگ برقرار رہی۔ ولیم پارلیمنٹ کے ایک زبردست زندہ دل رکن تھے جن کی پارلیمانی سرگرمیاں آج تک یاد کی جاتی ہیں۔

ولیم ولبر نے اکیس برس کی عمر میں کالج چھوڑا۔وہ 1780ء میں ھل شہر سے رکن پارلیمنٹ منتخب ہوئے جبکہ 1789 میں برطانیہ کے مشہور علاقے یارک شائر سے رکن پارلیمنٹ بنے۔انہی دنوں میں ان کے کئی ایک دوست احباب گرینویل شارپ کے ساتھ اینٹی سلیوری کمیٹی میں شریک ہوئے۔

ولیم ولبر نے 1789 میں غلام فروشی کی ممانعت کے لئے پارلیمنٹ میں بل پیش کیا تو غلام فروشی کے حامی اراکین بھی پوری قوت کے ساتھ ولیم ولبر کے بل کو پارلیمنٹ میں ناکام بنانے کے لئے سامنے آئے۔اس بل کا نتیجہ فقط یہ نکلا کہ جہازوں میں غلام لے جانے کی تعداد متعین ہوئی اور آزاد شدہ غلاموں سے روا رکھے جانے والے کچھ برتاؤ کو قابل سزا جرم قرار دیا گیا۔

گرینویل شارپ، تھامس کلارکسن، ولیم ولبر فورس اور تھامس فاؤویل بکسٹن اور ان کی تنظیم کے دیگر اراکین کی جانب سے مختلف مقامات پر کی گئی تقاریر اور اخباری مضامین نے برطانیہ کی رائے عامہ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، تاہم مشکل یہ تھی کہ امریکہ کے زمینداروں اور کارخانہ داروں کے ہاتھوں سے اگر شیدی غلام نکل گئے تو اس صورت میں ہونے والے کروڑوں کے نقصان کا ازالہ کون کرے گا۔اس دور کے ایک نامور شاعر کوپر نے ولیم ولبر کی نیک نامی اور ان کے مخالفین کی کارستانیوں کو اپنی شاعری میں کچھ اس طرح بیان کیا۔

او ولیم فورس! تم جو ذلتوں کے مارے لوگوں کو دلیس نکالی، فروخت عام اور غلامی کی زنجیروں سے

نجات دلانے کی تگ و دو کر رہے ہو اس لئے کچھ بے رحم اور بدنیت لوگ تمھیں دیوانہ سمجھتے ہیں ان القاب کو تمھارا پورا دیس سخت نفرت سے سن رہا ہے۔

1807 میں ولیم کی کوششوں سے پارلیمنٹ سے منظور ہونے والے بل میں کہا گیا تھا کہ آئندہ انگریز قوم کا کوئی بھی فرد غلاموں کی خرید و فروخت نہیں کر سکے گا اور انگریز حکومت کے تحت کسی بھی علاقے میں غلاموں کی خرید و فروخت بھاری جرمانے کے حامل سزا ہوگی۔

اینٹی سلیوری کمیٹی کے اراکین نے یہ قابل ذکر کامیابی حاصل کی تاہم ولیم اور ان کے دیگر ساتھی اس سے مکمل طور پر مطمئن نہیں تھے ان کی خواہش تھی کہ جو غلام امریکہ میں مختلف یورپی اقوام کے پاس ہیں وہ تمام آزاد کئے جائیں اور مستقبل میں غلاموں کی یہ تجارت دنیا بھر میں کہیں بھی نہ ہو۔

1823 میں ولیم نے اینٹی سلیوری سوسائٹی کو از سر نو زیادہ وسیع پیمانے پر بحال کیا۔1824 میں ولیم نے پارلیمنٹ میں ویسٹ انڈیز کے غلاموں کی حالت زار پر ایک دل سوز تقریر کی۔1829 میں اینٹی سلیوری سوسائٹی کے زیر اہتمام لندن میں ایک بہت بڑا عوامی اجتماع منعقد کیا گیا جس کے صدر ولیم ولبر فورس تھے، اس جلسے کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانیہ نے دو کروڑ اسٹرلنگ پاؤنڈ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی، جو کہ شیدی غلاموں کی آزادی کی وجہ سے امریکی زمینداروں اور کارخانہ داروں کو ہونے والے نقصانات کے ازالے کے طور پر ادا ہونے تھے۔

ولیم ولبر فورس 29 جولائی 1833 کو چوہتر برس کی عمر میں بائبل کا مطالعہ کرتے ہوئے انتقال کر گئے۔ولیم کے ذمے تمام تر کام اب تھامس فاؤویل بکسٹن کے حوالے ہوا۔

ج۔سر تھامس فاؤویل بکسٹن:

تھامس فاؤویل بکسٹن 1786 میں سسیکس کے علاقے میں پیدا ہوئے، بچپن سے ہی انہیں شکار اور کھیل کود کا شوق تھا۔سترہ برس میں کی عمر میں جب وہ ڈبلن کے ٹرنٹی کالج میں داخل ہوئے تو دیگر طالب علموں کو خود سے کم علم و آگہی کا حامل دیکھ کر، انہیں از خود مطالعہ کرنے کا شوق ہوا بعد ازاں کوئی ایسا انعام، میڈل سرٹیفکیٹ یا آفرین نامہ نہیں تھا جو بکسٹن نے کالج میں حاصل نہ کیا ہو۔کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ اپنے چچا کی تجارت میں شریک ہوئے، جلد ہی وہ

ویماؤتھ کے علاقے سے پارلیمنٹ کے رکن ہوئے۔

1828 میں ولیم ولبرفورس نے بکسٹن کو اپنا ساتھی بنایا، اس کے بعد وہ اینٹی سلیوری سوسائٹی کے ایک انتہائی جوشیلے اور کارآمد رکن بن گئے۔ بکسٹن کی تگ ودو سے ہی غلام فروشی کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہوا۔

اینٹی سلیوری سوسائٹی میں شمولیت کے بعد بکسٹن نے گرجا میں جا کر یہ مناجات کی:

اے قادر مطلق! غلام فروشی کے مسئلے کو حل کرنے میں مجھے اپنی حمایت بخش اور کامل پشت پناہی نصیب کر، اپنے روشن رخ کی تجلی مجھ پر وا کر۔ مجھے سیدھی راہ اختیار کرنے کی دانائی بخش اور اس پر قائم رہنے کی ہمت اور اپنے فرائض کی ادائیگی کی طاقت عطا کر۔ سنگدل اور طاقتور افراد کے من موم کی طرح پگھلا دے کہ وہ ایسے افتادگان خاک بے بس لوگوں کی مدد کیلئے آگے بڑھیں جن کے جسم وروح غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

بکسٹن کو یہ بے چینی تھی کہ کاش وہ دن جلد از جلد آئے جب لاکھوں غلام یکا یک آزاد انسان بن جائیں۔ امریکی زمینداروں، کارخانہ داروں اور غلام فروشوں نے اتنی شدت سے بکسٹن کی مخالفت کی کہ کافی عرصے تک حکومت انکی بات پر توجہ مبذول کرنے سے کتراتی رہی۔ اسی دوران کئی اخبارات کے مدیر بھی بکسٹن کے حمایتی ہو گئے، جنہوں نے مسلسل مضامین کے ذریعے پارلیمنٹ پر اپنا دباؤ بنائے رکھا، دوسری جانب بکسٹن بھی مختلف شہروں میں عوامی اجتماعات سے خطاب کر کے رائے عامہ ہموار کرتے رہے۔

بالآخر 1829 میں ایک بڑے اجتماع کے بعد امریکی شیدی غلاموں کو یکسر آزاد کرنے کا سوال پارلیمنٹ کے سامنے آیا اور چار برس کے تند و تیز بحث مباحثے کے بعد 1833 میں پارلیمنٹ نے قرارداد منظور کی کہ دو کروڑ اسٹرلنگ پاؤنڈ حکومت برطانیہ مختص کرتی ہے جو کہ امریکی زمینداروں اور کارخانہ داروں میں تقسیم کئے جائیں گے۔ آئندہ اگر کسی بھی زمیندار یا کارخانہ دار کے پاس کوئی شیدی غلامی کی حالت میں نظر آیا تو اسے خلاف قانون تصور کیا جائے گا۔

پورے امریکہ اور اس سے ملحقہ جزیروں میں جہاں جہاں انگریز سرکار کی حکومت تھی، یہ اشتہارات

تقسیم کئے گئے کہ یکم اگست 1833 کو شیدی غلاموں کی آزادی کا دن قرار دیا گیا ہے اس لئے 31 جولائی 1833 کو شب بارہ بجے تک ہر کوئی اپنے غلام آزاد کر دے۔

یکم اگست 1834 آزاد ہونے والے شیدیوں کیلئے خوشی کا ایک ایسا دن تھا جو انکے آباء اجداد کی زندگی میں کبھی بھی نہیں آیا تھا۔ مناسب ہوگا کہ دنیا بھر میں آج جہاں کہیں بھی شیدی آزادانہ حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں وہ ہر سال یکم اگست کو قومی مسرت کے طور پر منائیں۔

برطانوی پارلیمنٹ نے غلاموں کی آزادی سے متعلق 1833 میں جو قانون منظور کیا، اسکو اپنی ریاستوں اور نوآبادیات میں نافذ کرنے کی غرض سے فرانس، جرمنی، روس اور کچھ دیگر یورپی ممالک نے 1841 میں لندن میں ایک معاہدے پر دستخط کئے۔

اس کے بعد کسی بھی یورپی کمپنی کا کوئی بحری جہاز کسی بھی افریقی ساحل سے غلام نہیں لے سکتا تھا اور کوئی بھی بحری جہاز یا کشتی غلاموں کے ساتھ کسی ایسے جزیرے یا بندرگاہ سے گزر نہیں سکتے تھے جو کہ کسی یورپی قوم کے زیر انتظام ہو۔

برصغیر و ایشیاء، کے جس بھی علاقے میں تجارت یا حکومت کی بنا پر کوئی بھی یورپی قوم آتی / قابض ہوتی تو اس علاقے سے پہلے سے غلام بنائے لوگ آزاد ہو جاتے۔ سندھ میں شیدی غلاموں کو عام آزادی 1843 میں ہوئی جب انگریزوں نے سندھ کو فتح کیا۔

اس طرح آج دنیا کے کسی بھی گوشے میں غلاموں کی خرید و فروخت کا کوئی نام و نشان باقی نہیں بچا ہے۔

سر تھامس فاؤویل بکسٹن جیسے لوگوں کی انتھک کوششیں اس اعلیٰ درجے کے فلاحی کام میں اس مقام پر رک نہیں گئیں بلکہ انہوں نے استقلال سے اپنا سفر جاری رکھا۔ اینٹی سلیوری سوسائٹی کے اراکین نے اب فیصلہ کیا کہ بھولے بھالے شیدی جو کہ تا حال کروڑوں کی تعداد میں براعظم افریقہ میں رہائش پذیر تھے کو تہذیب و تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ امریکہ میں جو مختلف یورپی اقوام کی نوآبادیات ہیں، جن میں سے کچھ اپنی وطنی سرکار سے منسلک ہیں تو کچھ خودمختیار، ان تمام سے شیدی غلام آزاد کرائے جائیں اور انکو بھی تہذیب و تعلیم سے روشناس کرایا جائے۔

اس مقصد کے حصول کیلئے سر تھامس بکسٹن اور انکے احباب نے 1840 میں لندن میں ایک بڑے پیمانے پر عوامی اجتماع منعقد کیا، جس کی صدارت پرنس البرٹ (ملکہ الزبیتھ کے شوہر اور جارج پنجم کے دادا) نے کی۔ اس اجتماع کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کی تمام طاقتور حکومتیں غریب شیدیوں کی آزادی وفلاح کے معاملے پر انگریزوں سے متفق ہونے لگیں۔ مختلف یورپی اقوام نے افریقہ کے ساحلوں اور ممالک کے اہم شہروں میں اپنے مراکز قائم کئے اور انہیں تہذیب وتعلیم سے روشناس کرانے کا سلسلہ شروع کیا، دوسری جانب امریکہ میں بھی شیدیوں کی آزادی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے، انہیں تہذیب وتعلیم سے آراستہ کرنے اور انکے ضروری حقوق کے حصول کیلئے کوشش جاری رہیں۔

باب سوئم

امریکی شیدیوں کی مکمل آزادی اور فلاح وبہبود

1: ایام غلامی کے دوران حالات:

اسلام کی جانب سے ایشیائی شیدیوں کے ساتھ قائم کی گئی رعایت اور رواداری کو بیان کیا جاچکا ہے جو کہ امریکی شیدی غلاموں کو حاصل نہیں تھی۔ ایشیاء میں غلاموں کے مالکان اپنے غلاموں اور کنیزوں کی شرعی لحاظ سے شادیاں کراتے تھے اور کنیز کی شرعی اور غیر شرعی اولاد کی خود کفالت کرتے تھے۔ تاہم امریکہ میں غلاموں اور کنیزوں کی شادی کرانے کا کسی کو خیال تک نہیں آیا، ہر کوئی بے راہ روی اختیار کرتا جبکہ زچگی کے بعد ماں کو بچے کے ساتھ کوئی تعلق رکھنے نہیں دیا جاتا۔ زچگی سے فارغ ہوکر ماں کو کھیت یا کارخانے میں کام کرنا پڑتا جبکہ بچے کو کسی دوسری مقرر کر دہ جگہ بھیجا جاتا جہاں کوئی دایہ یا کوئی کنیز اسکی نگہداشت کرتی، جب یہ بچہ سات آٹھ برس کا ہوجاتا تو اسکا مالک بھاگ دوڑ جیسے کاموں پر لگاتا اس طرح ایک جگہ پیدا ہونے والے غلام بچوں کو کسی دوسری جگہ کام پر لگایا جاتا، کسی بھی شیدی بچے کو معلوم نہیں ہوتا کہ اسکے والدین کون ہیں، بمشکل ہی کوئی خوش نصیب ماں ہوتی جس کو مالکان اپنے بچے کے ساتھ رہنے کی اجازت دیتے۔

کھیتوں اور کارخانوں میں صبح سے شام تک ایک جانب غلاموں اور کنیزوں کو کام میں تیزی لاتے کی غرض سے کوڑوں کا نشانہ بنایا جاتا تو دوسری جانب بچوں کے سروں پر گھاس کی گٹھریاں یا اناج کی بوریاں یا کوئی دوسرا سامان ہوتا اور ان کی بھاگ دوڑ لگی رہتی۔ کسی بچے کی جانب سے سستی کا مظاہرہ ہوتے پر اس پر بھی کوڑوں کی برسات شروع ہوجاتی وہ چیخ وپکار کرتے لیکن ماں باپ کی عدم موجودگی میں کون انہیں بچانے کیلئے آگے آتا!

اتوار، ناتال اور ایسٹر کے ایام میں شیدی غلاموں کو سخت مشقت سے وقفہ نصیب ہوتا جس دوران وہ اپنے وطن سے بچھڑے اور غلامی کے دوران عذاب کے دل دہلانے والے گانے گا کر اپنے من کو ٹھنڈا کرتے۔

2۔آزادی کی نعمت:

ایشیاء کے فلسفی شیخ سعدی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ،

نہ ہرزن زن است نہ ہر مرد مرد

خدا پنچ انگشت یکساں نہ کرد

(ہر عورت، عورت کہلانے کے لائق نہیں نہ کہ ہر مرد،

خدانے پانچوں انگلیاں یکساں نہیں بنائیں)

وہ یورپی اقوام جو مذہب کی پیروی اور تہذیب کی دعویدار تھیں اور خدا کی تخلیق کردہ بے بس انسانی آبادی سے مذکورہ بالا غیر انسانی برتاؤ بھی کر رہی تھیں، ان میں کچھ ایسے بھی نیک دل انسان پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی زندگی کی پرواہ کیئے بغیر اپنا چین وسکون داؤ پر لگا کر، بے بس شیدیوں پر ان انسانیت سوز مظالم کے خاتمے کیلئے آواز بلند کی۔

گرینویل شارپ، تھامس کلارکسن، ولیم ولبرفورس اور سر تھامس فاؤویل بکسٹن جیسے شفیق انسانوں کی کوششیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں وہ فقط انگلینڈ تک محدود نہیں تھیں بلکہ انکی اینٹی سلیوری سوسائٹی کی شاخیں امریکہ کے مختلف مقامات پر بھی کام کر رہی تھیں جو کہ اس ظلم کے خلاف بیداری کے اہم مراکز بن گئے۔

امریکی کمیٹیوں کو رائے عامہ کی ہمدردی حاصل کرنے میں خاصی دقت پیش آئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ امریکہ کا وسیع ملک ہاتھ آنے کے بعد یورپ کے مختلف حصوں میں جو جو اقوام امریکہ میں آبادیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں وہ اپنی نوآبادیات کے اندرونی انتظام کے ضمن میں اپنی وطنی حکومت کے قواعد وضوابط کی پابند نہیں تھیں، فقط رسمی طور پر وہ اپنی حکومتوں کا احترام کرتیں یا اگر وہ کچھ محصولات اور لوازمات ادا کرتیں تو انکی دیسی حکومت اس پر مطمئن ہو جاتیں۔ یہ احترام اور لوازمات بھی 1776 تک برقرار رہے۔ ان حالات کے باوجود لندن کی اینٹی سلیوری سوسائٹی کی شاخیں امریکہ میں کسی ناامیدی کا شکار بننے کے بجائے اپنا کام کرتی رہیں۔

الف۔ جارج واشنگٹن:

امریکہ کے امیر لوگوں میں سے جس نے سب سے پہلے شیدی غلاموں کی حالت زار کو محسوس کیا وہ امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن تھے۔

جارج واشنگٹن کے پردادا جارج واشنگٹن ایک امیر شخص تھے جو 1657 میں برطانیہ سے نقل مکانی کر کے امریکہ آئے اور ورجینا کے علاقے ویسٹ مور کاؤنٹی میں دریائے پوٹومیک کے کنارے ہزاروں ایکڑ زمین خرید لی۔ جارج واشنگٹن کے پوتے آگسٹائن واشنگٹن کے دس بچے تھے جن میں سے پانچواں بچہ جارج 22 فروری 1732 کو پیدا ہوا۔

ورجینا کے علاقے میں نوآبادیات بنانے والے انگریزوں میں واشنگٹن خاندان معزز اور معتبر سمجھا جاتا تھا۔ نوآبادیات بنانے والوں کو جب بھی ریڈ انڈینز کے ساتھ جنگ کرنی پڑتی تو انکے لشکر کے اکثر سپہ سالار واشنگٹن خاندان سے ہی ہوتے۔

امریکہ میں رہائش پذیر انگریز اپنی اولاد کو ابتدائی تعلیم دلانے کے بعد مزید تعلیم کیلئے برطانیہ روانہ کرتے کیونکہ ان دنوں امریکہ میں قابل اساتذہ ناپید تھے۔ جارج واشنگٹن کے بڑے بھائی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے برطانیہ جا چکے تھے تاہم وہ پانچ برس کی عمر میں وہاں قائم ہونے والے ایک نئے اسکول میں داخل ہوا۔

یہ اسکول ایک پادری نے شروع کیا تھا، جو کہ ایک جنگ میں زخمی ہونے کے باعث ٹانگ میں نقص کی وجہ سے پنشن یافتہ تھے۔ علمی قابلیت تو ان میں کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن اسکول کا انتظام انہوں نے فوجی طرز پر رکھا ہوا تھا، انہیں اسکول اور رہائش کی جگہ جارج واشنگٹن کے والد نے دی تھی۔

جارج واشنگٹن ایماندار، باتمیز اور نہایت ادب واحترام کرنے والا بچہ تھا اسکول میں طلبہ اور اساتذہ انہیں "سچ گو جارج" کہہ کر بلاتے تھے۔

بارہ سال کی عمر میں امریکی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران جارج نے اپنی نوٹ بک میں کچھ قواعد وضوابط تحریر کیئے جن کے مطابق وہ اپنی زندگی کے معمولات گزارتے۔ انہوں نے اس نوٹ بک کو عنوان دیا، "دوستی اور گفتگو کی تمیز کے قواعد"۔ استاد اور جارج کے والدین کو جب اس

نوٹ بک کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تو انکی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

جارج کو گھر پر انکے والدین اخلاقی تعلیم کے ساتھ ایسی نصابی تعلیم دیتے کہ جو جارج کے استاد نے اپنے سپنے میں بھی نہیں سوچی ہوگی۔اس لئے جارج تہذیب وتمیز میں سب سے آگے ہونے کے ساتھ اسکول کی تعلیم میں بھی اول ہی رہے۔

جارج ابھی اسکول میں زیر تعلیم تھے کہ انکے والد کا انتقال ہوگیا،انکی والدہ جو ایک انتہائی شریف النفس اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں نے جارج کو اعلیٰ تعلیم کیلئے ایک قریبی شہر بھیجا۔وہ تعطیلات کے ایام اپنے بڑے بھائی لارینس واشنگٹن کے پاس گذارتے جو کہ اپنے والد کی جاگیر سنبھالتے اور اسی زمینداری کی وجہ سے ایک گاؤں ماؤنٹ ورنن میں رہائش پذیر تھے۔

لارینس نے ویسٹ انڈیز کی جنگ میں حکومتی فوج کی جانب سے بارہ ماہ تک نہایت عمدہ ملازمت کی تھی جسکی وجہ سے سرکاری حلقوں میں ان کا خاصہ احترام کیا جاتا،فوج کے اعلیٰ افسران اکثر انکے ہاں آتے۔انکی گفتگو نے جارج واشنگٹن کے من میں فوج کی ملازمت کا اشتیاق پیدا کردیا اور وہ سولہ برس کی عمر میں اسکول چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہوگئے۔

اس ملازمت کے دوران جارج واشنگٹن نے ایسا مقام حاصل کیا کہ جب تمام امریکی ریاستوں نے متحد ہوکر خود کو اپنی علیحدہ علیحدہ حکومتی زیردستی سے نجات حاصل کرنے کیلئے دیرپا جنگ شروع کی تو تمام ریاستوں کے مشترکہ لشکر کا کمانڈر انچیف جارج واشنگٹن کو ہی مقرر کیا گیا۔جب فتوحات حاصل کرکے تمام ریاستوں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ قائم کی تو 1789 میں اسکا اولین صدر بھی جارج واشنگٹن کو ہی منتخب کیا گیا۔

جارج واشنگٹن ایک بہت بڑے موروثی زمیندار تھے،انکی زمینوں پر ہزاروں شیدی غلام کام کرتے تھے،اس لئے وہ بچپن سے ہی شیدیوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں سے آگاہ تھے۔انکے تین بڑے بھائی تھے جسکی وجہ سے جارج کو نہ تو اسٹیٹ کے انتظامات براہ راست سنبھالنے کا موقعہ ملا اور نہ ہی وہ شیدی غلاموں کیلئے عملی طور پر کچھ کرسکے تھے۔

جارج واشنگٹن نے صدر بننے سے قبل اپنے ایک دوست جیمزسن کو ایک خط میں لکھا تھا۔۔"

حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں،میں آئندہ کوئی غلام خرید نہیں کروں گا۔میری دلی خواہش ہے کہ ایسا کوئی ملکی قانون منظور ہو جس کے تحت غلامی پر پابندی عائد ہو جائے کیونکہ قانون کے بغیر اس غلط رسم کے خاتمے کا کوئی امکان نہیں ہے"

ریاستوں کی جنگ آزادی کے دوران جارج واشنگٹن کے ایک دوست لافایٹ نے ایک جاگیر یہ سوچ کر خریدی کہ وہ اس جاگیر کے تمام ترشیدی غلاموں کو آزاد کردے گا۔جارج واشنگٹن نے ان دنوں اپنے اس دوست کو تحریر کئے ہوئے ایک خط میں لکھا۔

"جاگیر خرید کر کے غلاموں کو آزاد کرنے کے ارادے میں آپ نے اپنی انسانیت نواز سخاوت کو ثابت کیا ہے۔دعا ہے کہ ایسا احساس اس ملک کے لوگوں کے من میں عام ہو۔"

صدر ہونے کے دوران،انکی بیگم کی ایک شیدی کنیز فرار ہوگئی،بیوی نے اسکی بازیابی کیلئے زور ڈالا تو جارج واشنگٹن نے اپنی بیوی کو کہا"میں جو اپنے وطن کی آزادی کیلئے اتنی لڑائیاں لڑ چکا ہوں،وہ کسی مفرور غلام کو تلاش کرکے اسکی آزادی سلب کرنے کو درست نہیں سمجھتا۔"

صدر ہونے کے دوران جارج واشنگٹن نے غلامی کی رسم ممنوع قرار دینے سے متعلق پارلیمنٹ میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا تاہم مملکت کے ابتدائی ایام ہونے کی وجہ سے وہ اس کو عملی جامہ پہنا نہیں سکے۔

جارج واشنگٹن نے دسمبر 1899 میں اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل تحریر کی گئی اپنی وصیت میں واضح طور پر کہا تھا کہ "میرے مرنے کے بعد جو بھی شیدی غلام میری ملکیت ہیں انہیں آزاد کر دیا جائے۔"

جارج واشنگٹن کے انتقال کے بعد انکی وصیت کے تحت انکے تمام غلاموں کو تو آزاد کیا گیا بلکہ انکی پیروی کرتے ہوئے انکی بیگم اور کئی ایک عزیز واقارب نے بھی اپنے غلام آزاد کردیئے۔

اگرچہ جارج واشنگٹن باقاعدہ غلامی کی رسم کو ختم تو نہیں کرا سکے لیکن انکی بیان کی گئی رائے اور عملی ہمدردی نے پورے امریکہ میں غلامی سے متعلق عمومی ہمدردی کے اثرات کو پھیلانے کی انتہائی حوصلہ افزائی کی۔

(ڈبلیو ایم تھائر کی تصنیف "جارج واشنگٹن" سے ماخوذ)

ب۔ولیم لائیڈ گیرسین:

1823 میں جب حکومت برطانیہ نے غلاموں کی آزادی کیلئے ایک اشتہار جاری کیا اور غلاموں کے مالکان کو معاوضے کے طور پر دو کروڑ اسٹرلنگ پاؤنڈ کی ادائیگی کی منظوری دی تو شمالی امریکہ کے کینیڈا، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کچھ ریاستوں اور متعلقہ جزیروں میں جہاں جہاں براہ راست برطانیہ کی حکمرانی تھی وہاں شیدی غلام اور کنیزیں عمومی طور پر آزاد ہوگئے۔اس آزادی کے اعلان کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ریاستیں دوحصوں میں منقسم ہو گئیں،ایک جانب شمالی ریاستیں تھیں، جہاں غلامی ختم ہوگئی تو دوسری جانب جنوبی ریاستیں تھیں جو غلامی کو برقرار رکھنے پر زور دے رہی تھیں۔

پورے امریکہ سے غلامی کے خاتمے کیلئے جو امریکی شہری اینٹی سلیوری سوسائٹی میں نیک نیتی کے ساتھ کام کرتے رہے،ان میں سے ایک ولیم لائیڈ گیریسن بھی تھے۔

ولیم لائیڈ گیریسن شمالی ریاستوں کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں1804 میں پیدا ہوئے۔ایک غریب گھرانے سے تعلق ہونے کی بناء پر وہ اسکول کی تعلیم حاصل نہیں کرسکے،ابتدائی طور پر وہ ایک موچی کے ہاں کام سیکھنے لگے بعدازاں ایک بڑھئی کے پاس جبکہ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ ایک پرنٹنگ پریس میں ملازم ہوئے جہاں فراغت کے اوقات میں لکھنا پڑھنا سیکھنے لگے،اسی پریس میں انہیں مختلف موضوعات بالخصوص تاریخ پر مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔

اپنے حوصلے اور دانش کی وجہ سے وہ اپنی پریس سے شائع ہونے والے اخبارات اور جرائد میں مضامین لکھنے لگے۔نیک نیتی کی آواز اگر ہزاروں کانوں تک پہنچے گی تو کم ازکم درجنوں تو اس پر توجہ مبذول ضرور کرتے ہیں،چنانچہ غلامی کے خلاف تحریر کیئے ہوئے ولیم کے مضامین نے بھی امریکی اینٹی سلیوری سوسائٹی کی کوششوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔بعدازاں ولیم پرنٹنگ پریس کی ملازمت چھوڑکر جنوبی ریاستوں میں غلامی کے ایک اہم مرکز بالٹی مور میں ایک کثیرالاشاعتی اخبار کے نائب مدیر ہوگئے وہاں انہوں نے بے بس غلاموں کی حمایت میں یکے بعد دیگرے کئی ایک

مضامین لکھے جنہوں نے وہاں کے کٹھور دل امراء کے دل دہلا دیئے۔ امیر لوگوں کی جماعت نے ان پر قاتلانہ حملے بھی کرائے بالاخر انہیں دیوانی اور فوجداری مقدمہ میں ملوث کرکے چالیس دن قید اور جرمانے کی سزا دی گئی۔

جرمانے کی رقم تو اینٹی سلیوری سوسائٹی کے ایک صاحب ثروت رکن نے ادا کی جب کہ وہ سزا کاٹ کر سرخرو ہوئے۔

ولیم لائیڈ کو ملنے والی سزا نے غلامی مخالف افراد کی کوششوں کو مزید آگے بڑھایا اور ان کے مقصد کو مزید پذیرائی حاصل ہوئی۔ولیم لائیڈ اس سزا کی وجہ سے گھبرا کر اپنے کاموں سے دست بردار ہونے کے بجائے زیادہ پرجوش انداز میں اپنا کام کرنے لگے۔دوران قید انہوں نے خود کو سزا دینے والے جج مسٹر برائس کو ذیل درج خط تحریر کیا۔

کیا جج مسٹر برائس کی غضب ناک آنکھیں مجھے ڈرا سکتی ہیں؟

کیا ان کا فیصلہ میری اس آواز کو دبا سکتا ہے جو میں ظلم کے خلاف بلند کررہا ہوں؟

نہیں ہرگز نہیں۔مسٹر برائس سمجھ ہی نہیں سکتے کہ جب تک میری سانس باقی ہے کوئی بھی مجھے سچ کی آواز کو بلند کرنے سے روک نہیں سکتا۔غلامی کی رسم امریکہ کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔میں ہمیشہ ان لوگوں کے خلاف آواز بلند کرتا رہوں گا جو اس بدکاری کے حمایتی ہیں اور اپنے جیسے انسانوں کو غلام بناتے ہیں یا فروخت کرتے ہیں۔ہر سفید فام کا فرض بنتا ہے کہ ظلم کیخلاف اپنی قوم کو بیدار کرتے ہوئے اپنی جان کی بھی پرواہ نہ کرے۔

کچھ عرصے میں ولیم لائیڈ نے محسوس کیا کہ جنوبی ریاستوں کے مقابلے میں شمالی ریاستوں میں کام کرنا نسبتاً آسان ہوگا۔

چنانچہ اس نے شمالی امریکی شہر بوسٹن سے لبریٹر کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔

وہاں تنگ دستی کی وجہ سے وہ اور ان کے ساتھی ڈیڑھ برس تک پریس کے فرش پر سوتے اور انتہائی سادہ کھانا کھاتے۔صرف ایک شیدی لڑکا ان کے ہاں ملازم تھا۔

لبریٹر اخبار نے غلامی کے خلاف ایسی زوردار مہم شروع کی اور شمالی امریکہ رائے عامہ میں ایسی

بیداری پیدا کی کہ کئی ایک جنوبی ریاستوں نے اشتہارات جاری کیے گئے کہ لبریٹر کے مدیر کو گرفتار کرنے پر پانچ ہزار ڈالر انعام دیا جائے گا۔ 1845 میں بوسٹن میں تقریر کرتے ہوئے ولیم لائیڈ کو دو اہلکاروں نے آکر حراست میں لے لیا اور ان کے گلے میں رسی ڈال کر انہیں قید خانے میں بند کر دیا۔

ولیم لائیڈ نے قید خانے کی ایک دیوار پر تحریر کیا، "ولیم لائیڈ گریسن کو امیر لوگوں نے فقط اس گناہ کی وجہ سے 12 اکتوبر 1840 بروز پیر سہ پہر قید کیا کہ وہ یہ کہتا پھرتا ہے کہ خدا کی مخلوق برابر ہے اور اسے اپنی مخلوق پر کسی بھی قسم کا ظلم ناپسند ہے"

ولیم لائیڈ اور انکے دوستوں کی ان کوششوں میں پارلیمان کا کوئی بھی رکن شامل نہیں ہوا، اسکے باوجود شمالی ریاستوں میں انکا اتنا اثر ورسوخ پھیلا کہ بالآخر شمالی ریاستوں کو غلاموں کی آزادی کیلئے جنوبی ریاستوں کے ساتھ 1860 میں جنگ کرنی پڑی۔

(اردو رسالہ ماہنامہ عالمگیر لاہور، دسمبر 1933 سے ماخوذ)

ت۔ ابراہام لنکن:

جس نیک اور حق پرست ہستی کے ہاتھوں خدا تعالی نے امریکہ بھر سے غلامی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوایا وہ تھے ابراہام لنکن۔

ابراہام لنکن شمالی امریکہ کے کینٹکی علاقے کی ہارڈن کاؤنٹی میں 12 فروری 1809 کو پیدا ہوئے، انکے دادا برطانیہ سے نقل مکانی کر کے امریکہ میں مقیم ہوئے تھے جنہیں کاشت کاری کے دوران کسی ریڈ انڈین نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا، اس وقت ابراہام لنکن کے والد تھامس لنکن چھ برس کے تھے۔ تھامس لنکن ایک ناخواندہ بڑھئی تھے جبکہ ابراہام لنکن کی والدہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں تاہم انہیں بھی بائبل کے مطالعہ اور اپنا نام لکھنے کے علاوہ کی تعلیم نہیں تھی۔

ابراہام لنکن کی عمر آٹھ برس تھی کہ ان کا خاندان حارڈن کاؤنٹی سے انڈیانا کی اسپینسر کاؤنٹی منتقل ہوا جہاں ابراہام اپنے والد کے ساتھ بڑھئی کا کام کرتے۔ اسپینسر کاؤنٹی میں تھامس لنکن کے گاؤں سے آٹھ میل کی مسافت پر کسی نے ایک اسکول قائم کیا جہاں ابراہام لنکن اور انکی بہن علی الفجر تعلیم

حاصل کرنے کیلئے جاتے اور شام گئے اپنے گھر واپس آتے۔

ابراہام لنکن خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے جبکہ انکے استاد معمولی پڑھے لکھے تھے، چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اپنے استاد سے سارا علم حاصل کر کے وہ دوبارہ اپنے والد کے ساتھ بڑھئی کا کام کرنے لگے۔

سولہ برس کی عمر میں انہیں جیمس ٹاملر نامی ایک شخص کے پاس چھ ڈالر ماہانہ کی تنخواہ پر کشتی چلانے کی ملازمت مل گئی۔ وہ ایک مخلص محنت کش تھے اور کشتی کی مرمت کرنے، نئی کشتی تیار کرنے اور کسی بھی آبی صورتحال میں چپو چلانے میں سب سے زیادہ ماہر تھے۔ اس وقت ان کا قد چھ فٹ چار انچ تھا۔

تھوڑے عرصے کے بعد وہ جونز نامی گوشت کے ایک تاجر کے پاس قصائی کا کام کرنے لگے، وہاں بھی اپنی محنت اور ایمانداری سے نام کمایا۔

جونز کے ہاں کام کرتے ہوئے ابراہام لنکن کو لکھنے پڑھنے کے بہتر مواقع میسر ہوئے، وہاں روزانہ اخبارات کا مطالعہ کرنے کے علاوہ انہیں فرینکلن اور ھینری کلے کے سوانح عمریاں پڑھنے کا بھی موقعہ میسر آیا۔ اسکے علاوہ جونز کے ملاقاتی جو ملکی سیاسی صورتحال پر بحث ومباحثہ کرتے اسے بھی ایک ملازم کی حیثیت وہ بغور سنتے۔

جنوری 1830 میں تھامس لنکن اسپینسر کاؤنٹی سے نقل مکانی کر کے النائز منتقل ہوئے، جو اس زمانے میں اچھا بڑا شہر تھا۔

وہاں اپنی رہائش کیلئے گھر ابراہام لنکن نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا۔

الینائز میں ضلعی مشیر کے انتخاب کے دوران ابراہام لنکن پولنگ افسر کے کلرک بنے تو انہوں نے ابراہام لنکن کے کام سے خوش ہو کر انہیں نیو سالم میں ایک اپنے رشتہ دار کے ہاں منشی کی ملازمت دلوائی۔

اس گودام پر کام کرتے ہوئے ابراہام لنکن نے اپنی خوش اخلاقی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا دیا، نیو سالم کے اس گودام پر کام کے دوران ہی ابراہام لنکن کو شیدی غلاموں سے روا رکھے جانے والے سلوک کا ادراک ہوا۔

انہی دنوں ریڈ انڈینز کا ایک ٹولہ مسی سپی دریا پار کر کے الینائز کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔ جس کا ہدف سفید فام لوگوں کو مار بھگانا تھا یا انہیں جان سے مار دینا تھا۔ الینائز کے گورنر نے دشمن سے مقابلے کیلئے رضا کاروں کی چار پلٹنیں بھرتی کرنے کا اعلان کیا تو ابراہام لنکن اندارج کرانے والوں میں اولین تھے، بعدازاں گورنر نے ابراہام لنکن کو ان چاروں پلٹنوں کا کمانڈر مقرر کیا۔
ابراہام لنکن اپنے رضا کار لشکر کی مدد سے دو ماہ کی سخت مزاحمت کے بعد دشمن پر فتح یاب ہوئے۔ اس کامیابی نے انہیں سرکاری اہلکاروں کی نظر کا تارا بنا دیا جواب انہیں " کپتان لنکن " کہنے لگے تھے۔

وہ 1834 میں الینائز میں قواعد تیار کرنے والی کونسل کے رکن منتخب ہوئے جس کیلئے دو سو ڈالر قرضہ لیکر کپڑے اور جوتے خریدے۔ کونسل کا رکن ہوتے ہی انہوں نے قواعد کا مطالعہ شروع کر دیا اور اس طرح اعلیٰ پائے کے قانون دان بن گئے۔
1837 میں وہ وکلاء کی تنظیم میں شامل ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں بہترین وکلاء میں شمار کئے جانے لگے۔
1843 میں انکی شادی رابرٹ ایس ٹاڈ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ انکے چار بیٹوں میں سے ایک محکمہ جنگ کے سیکریٹری بنے۔ وہ 1846 میں کانگریس کے رکن ہوئے اور 1847 میں ایوان نمائندگان کے رکن بنے۔ اس دوران انہوں نے امریکی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا۔ 1848 میں جنرل ٹاملر کی صدارتی مہم اور بعدازاں جنرل سکاٹ کی صدارتی مہم کے دوران ابراہام لنکن کی مختلف شہروں میں تقریروں نے انہیں ملک بھر میں مشہور کر دیا۔
وکالت کے دوران ایک شیدی عورت ابراہام لنکن کے پاس اپنا ایک قانونی مسئلہ لیکر آئی کہ اُسے اور اُسکے بیٹے کو فلاں مالک نے آزاد کر دیا تھا لیکن اُسکا بیٹا اپنی لاعلمی میں کسی ایسے شہر چلا گیا جہاں غلامی کی اجازت تھی اور اُسے مفرور غلام سمجھ کر قید کر دیا گیا ہے، اب ابراہام لنکن اسکی رہائی کیلئے اقدام کرے۔
ابراہام لنکن نے اپنے ایک وکیل ساتھی کو مذکورہ شہر روانہ کیا تاہم قانونی طور پر کسی حاصلات سے

مستفید نہ ہو سکنے کے بعد انہوں نے اپنی جیب سے ادائیگی کر کے شیدی غلام کی آزادی کا بندوبست کیا۔
1854 میں اسٹیفن اے ڈگلس نامی ایک رکن نے ایوان میں بل پیش کیا کہ کینٹر اور نیبرا اسکا ریاستوں میں مفرور غلاموں سے متعلق کچھ سخت قواعد بنائے جائیں۔ ابراہام لنکن نے رکن کے طور پر ایوان میں ایک دلائل سے پُرتقریر کی جس نے ہر ایک کو انکا گرویدہ بنا دیا، بالآخر ایوان نے یہ بل مسترد کر دیا۔
1860 میں ریپبلکن پارٹی نے اپنے صدارتی امیدوار کے انتخاب کیلئے شکاگو میں ایک کنونشن منعقد کیا، جس میں ابراہام لنکن کو کثرت رائے سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا صدر نامزد کیا گیا، اس فیصلے نے جنوبی ریاستوں میں ایک بھونچال پیدا کر دیا کہ غلامی کا مخالف ایک شخص امریکہ کا صدر بن گیا تھا۔
انتخابات میں کامیابی کے بعد چرچ کے پادریوں کی جانب سے پیش کئے گئے سپاس نامے کے جواب میں ابراہام لنکن کا کہنا تھا۔
"میں سمجھتا ہوں کہ فقط ایک خدا ہے جو ناانصافی اور غلامی کو ناپسند کرتا ہے۔ میں ایک طوفان اُٹھتا ہوا دیکھ رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ اس میں بھی مالک کائنات کی مرضی ومنشا شامل ہے، اگر اس ضمن میں اُسے میری کوئی خدمت درکار ہوئی تو میں حاضر ہوں۔ میں خود کو حق پر سمجھتا ہوں کیونکہ آزادی ہر ایک کا بنیادی حق ہے۔"
بالآخر مارچ 1861 میں ابراہام لنکن صدر کی حیثیت سے واشنگٹن شہر میں واقع وہائٹ ہاؤس میں داخل ہوا۔
جنوبی ریاستوں نے پہلے ہی جنگ کی تیاریاں کر لی تھیں اور انکے مشترکہ لشکر نے اپریل 1861 میں ایک شمالی ریاست کے قلعے پر حملہ آور ہو کر خانہ جنگی کی ابتداء کر دی۔ جنوبی ریاستوں کی منشاء تھی کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی وحدانیت کو توڑ کر دو ریاستیں تشکیل دی جائیں، اور شمالی اور جنوبی ریاستیں آزادانہ طور پر اپنا نظام حکومت چلائیں۔ اس سے انکا اصل مقصد یہ تھا کہ غلامی کو

برقرار رکھنے والی انکی پالیسی میں کوئی مداخلت نہ ہو۔

ابراہام لنکن نے ٹیلی گرام کے ذریعے روابط کر کے مختلف جگہوں پر پچیس ہزار فوجی جوانوں کو تیار کیا۔ ایک آزاد، امیر اور باخبر شیدی رہنما فریڈرک ڈگلس (تفصیلی احوال آگے ملاحظہ کیجئے) نے ایک بہت بڑے وفد کے ساتھ ابراہام لنکن سے ملاقات کی۔ ابراہام لنکن نے فریڈرک کی انتہائی جانفشانی سے تیار کی گئی درخواست پڑھی اور اسکے اندراج سے انتہائی خوش ہوا۔ فریڈرک ڈگلس کی درخواست پر خانہ جنگی میں مصروف عمل لشکر میں شیدیوں کی شمولیت کو یقینی بنایا گیا۔

امریکہ میں وہ پہلے شیدی تھے جنہیں اعلیٰ افسران کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا موقعہ ملا، جو کہ غلام فروشوں کیلئے ایک انتہائی تکلیف دہ منظر تھا۔ فریڈرک ڈگلس کی کوششوں سے تھوڑے عرصے میں ایک لاکھ شیدی فوج میں بھرتی ہوئے، جن میں خود فریڈرک کے دو بیٹے بھی شامل تھے۔ شیدیوں کی یہ پلاٹوں امریکی تاریخ میں "میسوچوسٹس رجمنٹس" کے نام سے مشہور ہیں۔

ابراہام لنکن نے یہ شیدی پلاٹوں سفید فام افسران کے زیر کمان مختلف مقامات پر روانہ کیں۔

شیدیوں کو اُمید تھی کہ اس جنگ میں ابراہام لنکن کی زیر قیادت فتح انکی آزادی کی نوید ہوگی، اس لیے وہ جنگ میں تن من کے ساتھ شریک ہو گئے۔

خانہ جنگی کے دوران غلاموں کے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے ابراہام لنکن کو ایک تحریری درخواست پیش کی، جس میں گزارش کی گئی تھی کہ "جو شیدی بچے تا حال غلام ہیں، انکی آزادی کی کوئی سبیل نکالی جائے۔"

ابراہام لنکن نے ان بچوں کو اپنے روبرو بلا کر انتہائی اپنائیت کے لہجے میں بتایا کہ "آپ کے معصوم دلوں میں یہ قومی جذبہ دیکھ کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی ہے۔ اگر چہ یہ مطالبہ تسلیم کرنا سردست میرے بس میں نہیں تاہم اگر خدا نے چاہا تو یقیناً امریکہ جلد اس قابل ہو جائے گا۔"

خانہ جنگی کے دوران میدان جنگ میں قید ہونے والے شیدی سپاہیوں کے ساتھ سفید فام انتہائی ناروا سلوک کرتے۔ جب ایسی اطلاع ابراہام لنکن تک پہنچی تو انہوں نے عام و خاص کیلئے ایک عوامی اشتہار جاری کیا۔

ایگزیکٹیو منشن:

30 جولائی 1861۔ "اپنی مملکت کے شہریوں کا دفاع کرنا تمام حکومتوں کا فریضہ ہے، وہ چاہے کسی بھی حیثیت، رنگ یا نسل کے ہوں، بالخصوص ان کا دفاع جو مملکت کی کارگزاری کیلئے یا انتظام کیلئے سپاہی ہوں۔

مغربی اقوام کے جنگی دساتیر اور رواج، بالخصوص قومی قواعد و قانون اس امر کی اجازت نہیں دیتے کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ بالخصوص انکی رنگت کی بناء پر عوامی دشمن بنا کر ناروا سلوک کیا جائے۔ جنگی قیدیوں کو کسی جنگی قانون کی خلاف ورزی کے بجائے انکی رنگت کی بنیاد پر غلام بنانا یا غلام کی حیثیت سے فروخت کرنا جنگلی پن کا اظہار ہے اور تہذیب یافتہ زمانہ کے خلاف ایک جرم ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت اپنے تمام تر جنگی سپاہیوں کا یکساں دفاع کرتی رہے گی، اس لئے اگر ہمارے کسی بھی جنگی سپاہی کو کوئی فریق رنگت کی بنیاد پر غلام بنائے گا، فروخت کرے گا یا کوئی دوسری اذیت دے گا تو اس جرم کی پاداش میں ہمارے زیر قبضہ دشمن کے جنگی قیدیوں کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ اختیار کیا جائے گا۔"

اس اشتہار کے بعد دوران جنگ کسی بھی شیدی سپاہی کے ساتھ جنگی قیدی ہونے کی صورت میں کسی ناروا سلوک کی شکایت سامنے نہیں آئی۔

ایک سفید فام شخص کو غلام فروخت کرنے کے الزام میں پانچ سال قید اور ایک ہزار ڈالر جرمانے کی سزا ہوئی۔ قید کی مدت تو اس نے کاٹ لی جبکہ جرمانے کی معافی کیلئے کچھ معززین کا ایک وفد ابراہام لنکن کے پاس گیا تو انہوں نے اس وفد کو بتایا کہ،

"یہ ایک دل سوز اپیل ہے جو مجھے کی گئی ہے۔ مجھے رحم کی اپیل پر اتنا ترس آتا ہے کہ ممکن ہونے کی صورت میں کسی قاتل کو بھی معاف کر دیتا ہوں۔ لیکن اس شخص کو جو افریقہ جا کر بے بس لوگوں کو اپنے اہل و عیال سے علیحدہ کر کے فروخت کرے وہ بھی کچھ ڈالروں کے عیوض، میں خطرناک ترین قاتل سے بھی زیادہ بڑا مجرم سمجھتا ہوں اور اسکو معاف نہیں کر سکتا۔ اسکو سزا کاٹنے دو۔۔۔۔"

دوران خانہ جنگی جنرل وارڈ سورتھ نے شیدی سپاہیوں کیلئے تعریفی کلمات ادا کئے تو انکے جواب میں

ابراہام لنکن کا کہنا تھا کہ،

"شیدیوں کی حالت زار جو میری توجہ مبذول کرا رہی ہے، میں کس طرح بہتری لائی جاسکتی ہے پر میں عرصہ دراز سے سوچ رہا ہوں۔ میں نے قطعی فیصلہ کرلیا ہے کہ یہ مسئلہ سیاسی اور مذہبی بنیادوں پر کابینہ کے سامنے پیش کیا جائے۔

"قوم کے نگہبان ہونے کے ناطے مجھے ان شیدیوں کی بھی نگہبانی کرنی ہوگی جو میدان جنگ میں اپنی بہادری کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور ریاست کے دفاع میں مدد کرتے ہوئے اور حکومتی جھنڈے کو سربلند رکھنے کی خاطر بے خوفی سے اپنا خون بہا کر خود کو ووٹ کے حق حاصل کرنے کا اہل ثابت کر رہے ہیں۔"

جب خانہ جنگی کے دوران جنوبی ریاستوں کو شکست دیکر ابراہام لنکن آخری مورچے والے شہر رچمنڈ پہنچا تو وہاں شیدیوں کی خوشی دیدنی تھی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ابراہام لنکن انکی مستقل آزادی کا اعلان کرنے والا تھا۔

22 ستمبر 1862 کو صدر ابراہام لنکن نے سینیٹ کے سامنے شیدیوں کی مکمل آزادی کا اعلان کیا، جس کی پورے ایوان نے تائید کی۔ اس اعلان میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ،

"۔۔۔تمام افراد، جو ریاست ہائے متحدہ کی کسی بھی ریاست میں غلام بنائے گئے ہیں، چاہے وہ خانہ جنگی میں ریاست ہائے متحدہ کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں، وہ یکم جنوری 1863 سے قانوناً ہمیشہ کیلئے آزاد کیے جاتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ کی ایگزیکٹو حکومت اور بری اور بحری افواج ایسے افراد کی آزادی کے دفاع کو مقدم رکھیں گی۔ کسی بھی آزاد ہونے والے شخص کی جانب سے مکمل طور پر آزاد حیثیت سے زندگی گزارنے کی کہیں بھی کی جانے والی کسی بھی کوشش میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔۔"

گرینویل شارپ نے بے بس شیدیوں کی آزادی کیلئے جو کوشش اٹھارویں صدی کی وسط میں لندن سے شروع کی تھی وہ ایک سو سال بعد انیسوی صدی کے وسط میں مکمل طور پر کامیاب ہوگئی یعنی امریکہ کے شیدی غلاموں کو بھی مکمل آزادی حاصل ہوگئی۔

شیدی ابراہام لنکن سے اتنا پیار کرتے تھے کہ انہیں انکل لنکن پکارتے۔ خدا ترس، نیک دل اور بہادر

ابراہام لنکن جو جنگل کی ایک جھونپڑی میں پیدا ہوئے وہ 2 جنوری 1881 کو واشنگٹن میں چل بسے۔

(ڈبلیو ایم تھائر کی کتاب "ابراہام لنکن" سے ماخوذ)

3۔ پیش رفت

الف۔ فریڈرک ڈگلس (شیدی رہنما):

امریکہ میں پہلے شیدی رہنما، جنھوں نے اپنی قوم کی مکمل آزادی اور ترقی کیلئے تگ و دو کی، وہ فریڈرک ڈگلس تھے۔ ذیل میں انکی زندگی کا مختصر احوال پیش ہے۔

فریڈرک ڈگلس 1817 میں میری لینڈ کے شہر ایسٹون سے کچھ فاصلے پر واقع گاؤں ٹچاہیو میں پیدا ہوئے۔ اپنے بچپن میں وہ اپنی ادھیڑ عمر کی نانی کے پاس رہتے تھے جو کہ ایک خادمہ تھی، تاہم اسے یہ رعایت حاصل تھی کہ ایک جھونپڑی میں رہتے ہوئے اپنی پانچ بیٹیوں کے بچے پالنے پر انہیں دیگر کاموں سے چھوٹ مل جاتی تھی۔

فریڈرک اپنی والدہ کو دو یا تین مرتبہ ہی دیکھ پائے۔ ایک طویل عرصے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ انکے والد سفید فام تھے۔ بعد ازاں انہیں یہ بھی تجربہ ہوا کہ امریکہ میں کسی خادمہ کا بچہ، پھر چاہے اس کا والد کوئی شہزادہ ہی کیوں نہ ہو غلامی کی چکی میں پستا ہی رہے گا۔

فریڈرک کی والدہ ھیریٹ بیلی نے اپنے اس بیٹے کا نام فریڈرک آگسٹن واشنگٹن رکھا، شاید اس کا یہ خیال تھا کہ ایسا عمدہ نام انکے بیٹے کے چہرے سے باپ کی محرومی کا داغ دھو ڈالے گا۔

ھیریٹ اتفاقاً ملنے والے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر چوری چھپے اپنے بیٹے سے ملنے آتی کیونکہ صبح سے شام تک اسے اپنے مالک کے کھیتوں میں کام کرنا پڑتا جبکہ رات کو کسی غلام یا خادمہ کو مقررہ جگہ سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی، گویا وہ غلام تو تھے ہی لیکن قید بامشقت کے ساتھ۔

ابتدائی عمر میں تو فریڈرک کو اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ غلام کی حیثیت میں پیدا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ وہ اپنی پیاری نانی کے پیار میں مگن تھا اور ندی کے کنارے اپنی نانی کی جھونپڑی کو جنت سمجھتا تھا۔ اگر کوئی کہتا کہ وہ فلاں کا غلام ہے تو اس پر بھڑک اٹھتا۔

فریڈرک جب سات برس کا ہوا تو اسکی نانی دستور کے مطابق گیارہ میل پیدل چل کر اسے مالک کے پاس پہنچانے گئی۔فریڈرک نے وہاں اپنے کئی ہم عمر بچے دیکھے جو مختلف کاموں میں مصروف تھے۔فریڈرک ابھی اس بھاگ دوڑ کے سحر میں ہی تھا کہ اسکی نانی واپس اپنی جھونپڑی جا پہنچی تھی،جسکو فریڈرک نے دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔

اس ظالم ادھیڑ عمر کے مالک کے پاس کافی کھیت اور غلام خادمائیں اور بچے تھے۔وہ ایک امیر نوآبادیاتی اہلکار کا ایجنٹ تھا جو تیس زمینوں اور ایک ہزار غلاموں کا مالک تھا اور کسی بڑے شہر میں رہائش پذیر تھا۔اس جاگیر کا ہیڈ کوارٹر وہی تھا جہاں اب فریڈرک رہنے لگا تھا اور پوری جاگیر پر الگ الگ جگہوں پر کام کرنے والے غلام مہینے میں ایک مرتبہ اپنا راشن لینے ہیڈ کوارٹر آتے تھے جبکہ ان غلاموں کو سال میں ایک مرتبہ کپڑے بھی یہیں سے ملتے تھے۔

بوڑھے مالک نے فریڈرک کو ایک باورچی کے ساتھ کام پر لگایا۔باورچی کے تھپڑوں اور توہین آمیز برتاؤ کے بعد فریڈرک کو اندازہ ہوا کہ غلامی کس بلا کا نام ہے۔ایک دن بوڑھے مالک نے کسی غلام لڑکی کو کسی نافرمانی کی سزا کے طور پر چھت سے الٹا لٹکا کر کوڑے مارنا شروع کر دیئے۔فریڈرک لڑکی کی چیخ وپکار پر نیند سے اٹھ گیا اور اپنی جھونپڑی کی دراڑ سے یہ منظر دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگا۔

ہر مہینے راشن لینے کیلئے آنے والے غلام گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے جو دردناک گانے گاتے وہ فریڈرک کے من میں عجیب وغریب کیفیت پیدا کر دیتے،وہ ان لوگوں کی گائیکی پر عجیب حیرانگی کا شکار ہوتا۔

دو برس تک باورچی کے تھپڑ کھانے کے بعد فریڈرک کو اسکے بوڑھے مالک نے بالٹی مور شہر میں رہائش پذیر اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں بھیج دیا۔اس نئے مالک کی بیگم کے پاس کبھی کوئی غلام نہیں رہا تھا اس لئے وہ فریڈرک کو بلا معاوضہ ملازم ہی سمجھتی رہی۔چونکہ فریڈرک کو اس خاتون کے بچوں کی دیکھ بھال کرنی تھی اس لئے وہ فریڈرک کا خیال رکھتی اور اپنے بچوں کے ساتھ فریڈرک کو بھی بائبل کے مطالعے کے ساتھ دنیوی تعلیم دینے لگی۔

ایک دن خاتون کے شوہر نے فریڈرک کو پڑھتے ہوئے دیکھا تو اپنی بیوی سے سخت ناراض ہوگیا،کیونکہ اس کے خیال میں غلاموں کو لکھنا پڑھنا سکھانا سفید فاموں کے ہاتھ کاٹنے جیسا خطرناک تھا۔اسکے بعد نہ صرف فریڈرک کا لکھنا پڑھنا بند ہوگیا بلکہ وہ خاتون انتہائی ترش روی سے فریڈرک سے کام بھی لینے لگی۔

تاہم اس خاتون نے فریڈرک کو جو راہ دکھائی تھی اب وہ اس سے ہٹنے والا نہیں تھا۔اس لئے اس نے چوری چھپے اپنی صلاحیتوں سے بچوں کی کاپیوں اور کتابوں سے استفادہ کرنا شروع کیا،بازار وغیرہ جاتے ہوئے اسے کسی اخبار رسالے یا کتاب کا صفحہ ہاتھ آتا تو چھپا کر اپنی جھونپڑی میں لے آتا اور سب سے چھپ کر پڑھنے لگتا۔وہ سات سال تک بالٹی مور میں رہا،جس دوران اس نے اینٹی سلیوری سوسائٹی کے اراکین کے مضامین اور غلامی کے خلاف چیدم،فاکس اور ولیم پٹ کی تقاریر پڑھ لیں جس کی وجہ سے اس کے اندر میں ایک عجیب بے چینی اور بے آرامی پیدا ہوگئی۔

سولہ برس کی عمر میں فریڈرک کو ایک نئے مالک اور مالکن کے ہاں جانا پڑا جو کہ انتہائی بے رحم انسان تھے۔اپنے غلاموں سے سخت مشقت کے بعد وہ ان سے بھیک منگوا کر اپنا پیٹ بھرنے کیلئے کہتے۔اگر کسی پڑوسی سے تعلقات کشیدہ ہوتے تو اپنے غلاموں کو ان کے ہاں چوری کرنے یا املاک کو نقصان پہنچانے کیلئے بھیجتے۔اپنے مطالعے کی وجہ سے کچھ مختلف سوچنے والا فریڈرک اکثر اپنے مالکان کی حکم عدولی کرنے لگا۔

بالٹی مور سے بیس میل کے فاصلے پر ایک پادری زمیندار تھا جسکو عام لوگ "سرپھرے غلاموں کو راہ راست پر لانے والا" کہتے تھے۔وہ اتوار کے روز چرچ میں وعظ کرتا جبکہ باقی دن اچھے خاصے معاوضے پر مختلف لوگوں کے غلاموں کو راہ راست پر لاتا۔فریڈرک کو بھی اس نئے مالک نے راہ راست پر لانے کیلئے بارہ ماہ کیلئے اس پادری کے حوالے کیا۔

پادری ہر روز غلاموں کے ذمے ایسے کام لگاتا تاکہ ان سے کوئی غلطی ہو جاتی اور پھر انہیں شدید تشدد کا نشانہ بنانا پڑتا۔وہ پورا دن غلاموں کا تعاقب یا نگرانی کرتا اور کسی غلام کو کام کے دوران آرام کرتے ہوئے دیکھ کر مار پیٹ کرتا۔

فریڈرک زندگی میں پہلی مرتبہ کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ نو ماہ تک اُس نے پادری کے ہاں عذاب برداشت کیے۔ بالآخر ایک دن پادری فریڈرک کو برہنہ کر کے کوڑے مار رہا تھا تو فریڈرک نے وہی کوڑا چھین کر پادری پر برسانا شروع کر دیا، اس کے بعد پادری نے کبھی بھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اگرچہ پادری نے اس واقعے کی اطلاع نہ پولیس کو دی نہ ہی فریڈرک کے مالکان کو لیکن یہ بات جنگل کی آگ کی طرح ہر سو پھیل گئی۔

بارہ ماہ گزار کر جب فریڈرک دوبارہ اپنے مالکان کے پاس پہنچا تو انہوں نے اُسے بہت تبدیل محسوس کیا، جس کی وجہ سے انہوں نے اُسے فوری طور پر نکال باہر کیا۔ فریڈرک نے اب پکا ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ دوبارہ کسی کی غلامی میں نہیں جائے گا چاہے اُسے مار دیا جائے۔

فریڈرک کا نیا مالک ایک فیکٹری کا مالک تھا جس کے ہاں سینکڑوں شیدی غلام کام کرتے تھے۔ وہ انتہائی رحم دل شخص تھا، اگر اسکا کوئی ملازم کسی غلام پر ناجائز سختی کرتا تو وہ غلاموں کی شکایت بھی سنتا۔ فریڈرک نے کچھ عرصہ غلاموں کی اس بڑی تعداد کے ساتھ رہنا مناسب سمجھا؛ وہ اس طرح کام کرتا کہ کبھی بھی اسکے خلاف کسی شکایت کا موقعہ نہیں آیا۔ فرصت کے اوقات میں بالخصوص رات کو وہ غلاموں کو لکھنا پڑھنا سکھاتا اور بائبل کا درس بھی دیتا۔ بارہ ماہ کے عرصے میں اس نے چالیس غلاموں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا۔

اک مرتبہ فریڈرک دیگر پانچ غلاموں کے ساتھ ساز باز کر کے، ایک کشتی کے ذریعے وہاں سے فرار ہو گیا۔ مچھیروں کا بہروپ اختیار کرنے کی وجہ سے ہر ایک نے یہی سمجھا کہ وہ کسی مچھلی فروش کے غلام ہیں۔ اسی میل تک اس کشتی میں سفر کرنے کے بعد وہ جنگل کی راہ چلنے لگے۔

فریڈرک رات میں ستاروں کی مدد سے سفر کرتا جب کہ دن درختوں کے کسی گہرے جھنڈ میں گزارتا۔

بالآخر وہ نیویارک پہنچ گیا۔ جہاں مفرور غلاموں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی تھی۔ نیویارک کے آزاد شیدیوں نے کھانے پینے اور کپڑے لتے میں فریڈرک کی مدد کی، فریڈرک اس وقت لگ بھگ بیس برس کا نوجوان تھا۔ وہ بحری جہازوں کی گودی پر کام کرنے لگا اور فرصت کے اوقات

میں مقامی شیدیوں کو منظم کرنے کی کوشش اور لکھنے پڑھنے اور بائبل کی تعلیم دینے لگا۔ اگرچہ فریڈرک کی دلی خواہش تھی کہ وہ برسرِ عام اپنا کام کرے تاہم آزادی کا پروانہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ تا حال غلام تھا اس لئے کچھ تحریر کرنے یا تقریر کرنے سے قاصر تھا۔ نیویارک کے شیدیوں نے فریڈرک کو اینٹی سلیوری سوسائٹی کے سفید فام اراکین سے متعارف کرایا جو فریڈرک کی گفتگو میں قومی جوش و خروش دیکھ کر انتہائی خوش ہوئے۔ وہاں اُسے انگنت کتابیں، رسائل اور اخبارات بھی مطالعے کیلئے نصیب ہوئے۔ فریڈرک نے نیویارک کی ایک شیدی خاتون سے شادی بھی کر لی۔

سوسائٹی اراکین کی خواہش تھی کہ ایسے جوشیلے اور کارآمد شخص کیلئے آزادی کا پروانہ حاصل کیا جائے اس لئے انہوں نے کسی طرح فریڈرک کو برطانیہ جانے والے ایک بحری جہاز پر سوار کرا دیا، نیویارک میں ہی فریڈرک نے اپنا نام فریڈرک ڈگلس ظاہر کیا جو آخر تک برقرار رہا۔

فریڈرک ڈگلس نے اپنی آپ بیتی تحریر کی جس میں اُس نے اپنی زندگی کے تمام تر تجربات بیان کئے۔ یہ کتاب بڑی تعداد میں امریکہ اور انگلینڈ کے قارئین کے زیرِ مطالعہ رہی۔

فریڈرک نے دو سال انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور آئر لینڈ میں مختلف مقامات پر تقاریر کیں، جس دوران اُسکے پاس عطیات بھی جمع ہوئے اور امریکی شیدی غلاموں کیلئے ہمدردی بھی۔ برطانیہ کے ایک نیک شخص نے فریڈرک کے سابق مالک کو چھ سو ڈالر کی ایک خطیر رقم ارسال کی جو اس دور میں کسی غلام کیلئے سب سے زیادہ رقم تھی، جس پر اس کے سابق مالک نے فریڈرک کی آزادی کا پروانہ جاری کر دیا۔

1847 میں فریڈرک ڈگلس اچھے خاصے عطیات کے ساتھ ایک آزاد شیدی کی حیثیت میں امریکہ واپس آ گیا اور روچیسٹر شہر سے "قطبِ شمالی" نام کا اخبار جاری کیا۔ اخبار کے ساتھ وہ مختلف شہروں میں تقاریر کرتے اور آزاد اور مفرور غلاموں کو متحد ہونے اور تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے۔

اسی دوران فریڈرک ڈگلس کی ملاقات ایک پرجوش شیدی جان براؤن سے ہوئی، جس نے ورجینیا اور میری لینڈ کے پہاڑی سلسلوں میں کئی آزاد اور مفرور شیدی منظم کئے ہوئے تھے جبکہ وہ اس دوران جنگی سامان بھی جمع کرتا رہتا تھا؛ اس کا ارادہ تھا کہ موقعہ پاتے ہی بڑی بڑی جاگیروں پر

حملہ کیا جائے۔

فریڈرک ڈگلس نے اُسے ایسے خطرناک منصوبے سے باز رکھنے کی سرتوڑ کوشش کی اور اسکے ساتھ طویل بحث ومباحثہ کیے تاہم وہ فریڈرک ڈگلس کی باتوں سے متفق نہیں ہوا۔ فریڈرک مختلف مقامات سے جان براؤن کو طویل خط لکھتے جس میں قوم کی بہتری کیلئے پرخطر راستہ ترک کر کے پُرامن جدوجہد اختیار کرنے کا مشورہ ہوتا۔

جان براؤن نے دو تین کامیاب ڈاکے مارے جن میں ہزاروں غلام آزاد کر کے اپنے ٹولے میں شامل کر لئے بالآخر ایک ڈاکے کے دوران وہ گرفتار ہو گیا اور مقدمے کے بعد اسے پھانسی کی سزا دی گئی۔ جان براؤن کے گھر کی تلاشی کے دوران فریڈرک ڈگلس کے کچھ خطوط بھی بازیاب ہوئے جس پر ورجینا اور میری لینڈ ریاستوں میں انکے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کئے گئے۔ فریڈرک ڈگلس اسکی اطلاع ملتے ہی برطانیہ چلے گئے، جہاں وہ چھ ماہ تک مقیم رہے تا وقتیکہ 1860 میں ابراہام لنکن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر ہوئے اور ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ فریڈرک ڈگلس فوراً امریکہ واپس آگئے کیونکہ ریاستوں کے درمیان خانہ جنگی کی وجہ سے انکی گرفتاری کے خدشات ختم ہو گئے تھے۔

خانہ جنگی کے نتیجے میں شیدیوں کی غلامی کے خاتمے کے بعد فریڈرک ڈگلس مسلسل بتیس سال امریکی شیدیوں کی تنظیم، تہذیب اور تعلیم کیلئے کوشش کرتے رہے جنکی حکومتی حلقوں میں بھی پذیرائی ہوئی۔

1877 میں فریڈرک ڈگلس کولمبیا کے مارشل اور بعدازاں ریکارڈ مقرر ہوئے جو کہ اعلیٰ سرکاری عہدے تھے۔ 1889 میں ہیٹی کے قونصل جنرل مقرر ہوئے، اس دوران انہوں نے یورپ اور افریقہ کے کئی علاقوں کا دورہ کیا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ اپنی یورپی بیوی کے ساتھ واشنگٹن کی ایک شاندار عمارت کے مالک تھے جہاں 1895 میں انکا انتقال ہوا۔

(لندن کے My Magzine کے جون 1933 کے شمارے سے)

ب۔ بوکر ٹی واشنگٹن (شیدی رہنما):

ابراہام لنکن نے امریکی شیدی غلاموں کی آزادی کا اعلان کیا تو اکثر لوگوں نے اسے لعنت ملامت کے ساتھ کام سے آزادی سمجھا تاہم کچھ دوراندیش صاحبان کا خیال تھا کہ تہذیب و تعلیم کے بغیر آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ اس طور ہر سال بے شعور شیدیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا جو کہ ملک کے تمدن وتہذیب کیلئے ایک خطرناک بات ہوگی۔ یہ امریکی شیدیوں کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں بوکر ٹی واشنگٹن جیسا رہنما میسر ہوا۔

بوکر ورجینا میں غلام کی حیثیت سے پیدا ہوئے، انکی والدہ کھیتوں میں کام کرنے والے غلاموں کیلئے کھانا تیار کرنے پر مامور تھیں۔ دونوں ماں بیٹے باورچی خانے سے متصل ایک جھونپڑی میں رہتے تھے، جس میں سرد ہواؤں کیلئے کوئی رکاوٹ نہیں تھی جبکہ بوکر کے پاس کپڑوں کے نام پر پٹ سن کی بوری سے تیار کردہ کپڑے ہی تھے۔

سات آٹھ برس کی عمر میں بوکر اپنے مالک کی نوجوان بیٹی کی کتابیں اُٹھا کر اسکول جانے میں اس کی ہمراہی کرتا تھا، اسکول کے بچوں کو تعلیم حاصل کرتا دیکھ کر اس کا جی مچل جاتا لیکن کس میں جرات تھی کہ کسی غلام بچے کو لکھنا پڑھنا سکھاتا۔

ابراہام لنکن کی جانب سے آزادی کے اعلان کے بعد بوکر کی والدہ نے ایک شیدی سے شادی کر لی جو اپنی بیوی اور بوکر کے ہمراہ ورجینا کی مغربی سمت نمک میدان منتقل ہو گیا۔ بوکر کے سوتیلے والد نے نمک کی بھٹیوں کے درمیان اپنی رہائشی جھونپڑی بنائی جو صحت کے لحاظ سے غلامی کے دنوں کی جھونپڑی سے بھی بدتر تھی۔

بوکر کو اسکے سوتیلے والد نے نمک کی بھٹی پر کام سے لگایا جہاں اُسے علی الصبح سے سہ پہر چار بجے تک کام کرنا پڑتا۔ اسی دوران کسی نے قریب ہی ایک اسکول قائم کیا، جس میں داخلہ کیلئے بوکر نے تگ ودو شروع کر دی، تاہم اسکے سوتیلے والد نے شرط عائد کی کہ وہ علی الصبح کام کرنے کے بعد اسکول کے معمول کے اوقات کے بعد باقی ماندہ کام کرے گا، جسے بوکر نے مان لیا۔ اسکول میں داخلہ کے

وقت بوکر نے محسوس کیا کہ تمام تر بچوں کا دوسرا نام بالخصوص انکی ذات کے ساتھ ہے تو اُس نے بھی اپنا نام بوکر ٹی واشنگٹن اختیار کیا جو آخر تک اسکے نام کے ساتھ جڑا رہا۔

بوکر کے مطابق " آزادی کے اعلان کے بعد آزاد ہونے والے شیدیوں کو دو چیزیں لازمی طور پر کرنا پڑیں، ایک تو اپنے صیغہ واحد میں نام مثلاً جان، لاگ، اسٹیون، بوکر وغیرہ کو تبدیل کرنا اور دوئم یہ کہ جن کھیتوں یا کارخانوں میں وہ کام کررہے تھے، انہیں چھوڑ کر کسی دوسرے شہر یا گاؤں میں جا کر رہنا۔"

کوئی ایک سال کے بعد ایک کوئلے کی کان شروع ہوئی جہاں مزدوروں کو مناسب معاوضہ مل رہا تھا، بوکر کے سوتیلے والد نے بوکر کو بھی اس کان میں بھرتی کرادیا تاہم ایک تو کام کی نوعیت کے لحاظ سے اور پھر لکھنے پڑھنے کیلئے وقت نہ ملنے کی وجہ سے بوکر کو یہ کام شدید ناپسند تھا۔

کچھ عرصے کے بعد بوکر کو معلوم ہوا کہ ورجینا میں شیدیوں کیلئے ایک اسکول قائم کیا گیا ہے جہاں بورڈنگ ہاؤس اور محنت مزدوری کا بھی اہتمام ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی بوکر اپنی محنت مشقت سے کمائے ہوئے تین چار ڈالر اور کتابیں لیکر ورجینا جا پہنچا، جہاں اُسے بتایا گیا کہ چونکہ وہ بہتر انداز میں لکھ پڑھ سکتا ہے اس لئے ھمپٹن کے نارمل اسکول میں جا کر تعلیم حاصل کرنا ہی اس کے لئے مناسب ہوگا۔

ھمپٹن کا نارمل اسکول جنرل سَیمپٹن آرم اسٹرانگ نے 1828 میں شیدیوں کیلئے قائم کیا تھا جہاں اس وقت ایک ہزار سے زائد شیدی لڑکے اور لڑکیاں زیرِ تعلیم تھے۔ وہاں پر مذہبی، اخلاقی اور ہنری تعلیم پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

بوکر ورجینا سے سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے ھمپٹن پہنچا تو سفر کی تھکاوٹ، بھوک، پیاس اور بدحالی کی وجہ سے اسکا برا حال تھا۔ اسکی یہ بدحالی دیکھ کر اسکول انتظامیہ نے اسے اسکول میں داخلہ دینے سے انکار کردیا تاہم ایک رحم دل خاتون اُستاد نے معمولی تنخواہ پر اُسے خاکروب کی ملازمت دے دی۔ بوکر نے اس کام کو غنیمت سمجھا جس دوران اُسے دن میں دو مرتبہ جھاڑو وغیرہ لگا کر صفائی کرنی پڑتی۔ وہ اسکول کی کتابیں اور دیگر اشیاء مختلف طالب علموں سے مستعار کرتا اور رات کو

آگ جلا کر یا اسکول کے شمع دان کے نیچے یا دن میں فرصت کے اوقات میں مطالعے میں مصروف ہوجاتا۔ بوکر کی محنت اور پڑھنے لکھنے میں اسکے اشتیاق نے اساتذہ کے دلوں میں رحم کے جذبات پیدا کردیئے اور اُسے جھاڑو صفائی سے ہٹا کر اسکول کا چوکیدار بنا دیا گیا اور لکھنے پڑھنے کے ضمن میں بھی اس کو کچھ سہولیات فراہم کی گئیں۔

اساتذہ کی اس ہمدردی کا بوکر پر یہ اثر ہوا کہ وہ خود سے کمزور لوگوں کی مدد میں سب سے آگے رہتا۔ ان دنوں امریکہ کے لوگوں میں یہ ذہنی رجحان عام تھا کہ تعلیم حاصل کرنے کی معنی خود کو جسمانی محنت اور مشقت سے نجات دلانا ہے تاہم بوکر کا خیال تھا کہ " لکھنے پڑھنے کے ساتھ کسی ہنر یا جسمانی محنت و مشقت کی چاہ نہ صرف اضافی آمدنی کا باعث ہوگی بلکہ اسکے نتیجے میں انسان خودداری اور جسمانی صحت کا بھی حامل ہوگا۔"

بوکر نے اپنی محنت اور صلاحیت سے چوکیداری کرتے ہوئے اتنی علمی قابلیت اور لیاقت حاصل کرلی کہ اسکول انتظامیہ نے اُسے نائٹ اسکول کا انچارج مقرر کردیا، جس میں محنت کش شیدی مرد و خواتین روزانہ دو گھنٹے تعلیم حاصل کرتے تھے۔

بوکر واشنگٹن لکھتے ہیں، "اُستاد کی حیثیت سے میں نے یورپین ریڈ انڈینز اور شیدی طالب علموں کو تعلیم دی ہے تاہم شیدی طالب علموں کی علم حاصل کرنے کی لگن سب سے زیادہ اور منفرد ہے،" بوکر واشنگٹن کا پسندیدہ مقولہ تھا کہ، "شیدیوں سے آگے بڑھنے کی توقع کبھی بھی ختم نہیں کرنا۔"

ت: نارمل انڈسٹریل انسٹی ٹیوٹ، ٹسکیگی:

1881 میں الاباما علاقے کے شہر ٹسکیگی کے باشندوں نے ہمپٹن اسکول کیلئے ایک قابل اُستاد کی درخواست کی تو اسکول انتظامیہ نے بوکر ٹی واشنگٹن کو وہاں بھیج دیا۔ الاباما جنوبی ریاستوں میں شیدیوں کی ایک بہت بڑی آبادی کی ریاست ہے۔

بوکر نے ٹسکیگی اسکول کا انتظام سنبھالا تو وہاں پر فقط دو کچی جھونپڑیاں تھیں، جن میں سے ایک

اسکول کے طور پر جبکہ دوسری طلبہ کے چرچ کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔اسکول کی جھونپڑی کی حالت یہ تھی کہ بارش کے دوران ایک طالب علم اُستاد کے سر پر چھتری تان کر رکھتا تھا،تا کہ اُسے بھیگ جانے سے بچایا جاسکے۔

اسکول کے اوقات کار کے بعد بوکر طلبہ کے ساتھ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کرلاتا تو کبھی طلبہ سے بھٹی میں اینٹیں بنانے کا کام لیتا، یہ تمام تر کام بوکر نے ہمپٹن اسکول میں سیکھے تھے۔اسکول کی ابتدائی پکی عمارتیں بوکر نے اپنے طالب علموں کی مدد سے تعمیر کیں۔

اسکول فنڈ:

ابتداء میں حکومت نے اس اسکول کیلئے فقط دو ہزار ڈالر کی گرانٹ دی، بعدازاں کچھ سفید فام افراد نے بھی اسکول کیلئے عطیات دیئے۔بوکر ٹی واشنگٹن تعطیلات کے دوران مختلف شہروں میں تقاریر کر کے اسکول کیلئے چندے کی درخواست کرتے، اس ضمن میں وہ برطانیہ بھی گئے۔ایک نامور امریکی ادارے کے مالک روزن والڈ نے یکمشت پانچ ہزار پاؤنڈ کا عطیہ دیا۔

اس طرح 1914 میں بوکر ٹی واشنگٹن کے انڈسٹریل انسٹی ٹیوٹ ٹسکیگی کا فنڈ ساٹھ لاکھ ڈالر ہوگیا۔1916 میں اسکول کے سالانہ اخراجات سات لاکھ ڈالر جبکہ سالانہ آمدنی چودہ لاکھ ڈالر تھی۔

اسکول کی موجودہ عمارتیں اور املاک:

1881 میں بوکر ٹی واشنگٹن کی جانب سے دو جھونپڑیوں میں چلائے جانے والے اسکول میں 1916 کے دوران ایک سو سات پکے کمرے تھے جن میں کچھ تدریسی کمرے، کچھ زرعی تعلیم کے کمرے، کچھ بڑھئی اور انجینئرنگ کی کلاسیں، خواتین کے ہنر سیکھنے کی کلاسیں، چاول صاف کرنے اور پیسنے کے کمرے، باورچی خانے، اساتذہ کی رہائش گاہیں، ملازمین کی رہائش گاہیں اور مویشی کے اصطبل شامل تھے۔

طلبہ کو زرعی تعلیم دینے اور اسکول کی آمدنی میں مدد کیلئے ابتدائی طور پر فقط ایک سو ایکٹر زمین دی گئی تھی تاہم اب بتیس ہزار دو سو چھپن ایکٹر زمین اس اسکول کی ملکیت ہے۔اسی ایکٹر سبزیوں کی

کاشت کیلئے، اسی ایکٹر پھولوں کی کاشت، تیرہ سو ایکٹر اسکول کی مویشی کے چراہ گاہ جبکہ باقی ماندہ زمین مختلف اقسام کے اناج، کپاس اور دیگر فصلوں کیلئے مختص ہیں۔ہزاروں کی تعداد میں گائیں، بیل، سوئر، گھوڑے، خچر اور ٹٹو اس اسکول کی ملکیت ہیں۔

طلبہ اور عملہ:

بوکر ٹی واشنگٹن نے 1871 میں تیس لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ یہ اسکول شروع کیا تھا، اس میں 1916 میں امریکہ بھر کی اڑتالیس ریاستوں سے تعلق رکھنے والے آٹھ سو چھیانوے شیدی لڑکے اور چھ سو اکتیس لڑکیاں زیر تعلیم اور زیر تربیت تھے جبکہ مرد و خواتین اساتذہ کی کل تعداد دو سو اٹھارہ تھی۔

یہاں پر دو نوعیت کے طلبہ ہیں، ایک نوعیت کے طلبہ و طالبات دن میں اسکول کے کھیتوں اور دیگر مقامات پر کام کرتے جبکہ رات کی کلاسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، انکے دن میں کی گئی محنت و مشقت کے معاوضے میں سے، جو کہ اسکول کی جانب سے ادا کیا جاتا ہے، انکے تدریسی اخراجات منہا کر کے باقی ماندہ رقم انکے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرائی جاتی ہے، دوسری نوعیت کے طلبہ و طالبات ہفتے میں تین دن اسکول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جبکہ تین دن اسکول کے قرب و جوار میں واقع مختلف کارخانوں میں محنت مزدوری کرتے ہیں، انکے تعلیمی اخراجات بھی انکے معاوضے سے مہیا ہوتے ہیں۔اس طرح کسی بھی طالب علم کے والدین کو انکے تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کرنے پڑتے۔تعلیم مکمل کرنے والے طلبہ و طالبات کے پاس تعلیم و ہنر کے ساتھ اپنی محنت سے جمع کی ہوئی کچھ رقم بھی ہوتی ہے، جس کے ذریعے وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔

اسکول میں طالب علموں کیلئے فوجی نوعیت کا ضابطہ اخلاق وضع کیا گیا ہے۔مختلف جماعتوں میں تعلیم حاصل کرنے والے اور کام کاج کرنے والوں کے علیحدہ گروپ مقرر ہیں، نوے طلبہ پر ایک کمانڈنگ افسر ہے، علی الصبح پانچ بجے گھنٹہ بجنے پر ہر کپتان اپنے گروہ کے ساتھ مقررہ کام کاج میں مصروف ہوجاتا ہے۔طالب علموں میں تعلیم کے ساتھ کام کاج کا رجحان اس قدر مضبوط ہے کہ کسی طالب علم کو سزا کے طور پر کام کاج سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

1921 تک کے چالیس برسوں میں بارہ ہزار سے زائد شیدی طالب علم علم و ہنر کے ساتھ اس اسکول سے فارغ التحصیل ہوئے۔ نیو انگلینڈ کی یونیورسٹی نے بوکرٹی واشنگٹن کی ان خدمات کے صلے میں انہیں "ڈاکٹریٹ" کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ ڈاکٹر بوکرٹی واشنگٹن نے اپنی خدمات کو صرف نارمل انڈسٹریل انسٹی ٹیوٹ ٹسکیگی کے ذریعے شیدیوں کی بہتری تک محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے اسکا دائرہ امریکہ بھر میں پھیلا دیا، 1927 تک مختلف امریکی ریاستوں میں شیدیوں کیلئے چھوٹے بڑے چھ ہزار اسکول برپا ہو چکے تھے، جن کا تعلق ٹسکیگی فنڈز سے تھا۔ بوکرٹی واشنگٹن نے 1904 میں شیدی کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ جو آج تک کام کر رہی ہے۔ ٹسکیگی انسٹیٹیوٹ کے زیر اہتمام کل چھبیس ادارے ہیں جو مختلف شعبہ جات میں شیدیوں کی فلاح و بہبود میں مصروف ہیں۔

ڈاکٹر بوکرٹی واشنگٹن نے ہر اسکول میں زیر درج عبارات پر مشتمل بورڈ آویزاں کرائے ہیں:

1: جاہل شخص آزادی کے لائق نہیں ہوسکتا۔

2: کاہل اور سست شخص کبھی بھی خودمختار نہیں ہوسکتا۔

3: اچھے چال چلن اور رویے کے بغیر کوئی بھی مرد اثر و رسوخ حاصل نہیں کرسکتا جبکہ ان کے بغیر کوئی عورت حقیقی معنی میں خوبصورت ہو ہی نہیں سکتی۔

دنیا کے روز و شب پر نظر رکھنے والے اکابرین کا کہنا ہے کہ دنیا میں کسی بھی گروہ نے پچاس برسوں میں ایسی ترقی نہیں کی جیسی امریکی شیدیوں نے کی ہے۔ امریکہ میں شیدی تاحال کچھ ثقافتی، سیاسی اور معاشی حقوق سے محروم ہیں جنکے لئے انکی جد و جہد جاری ہے۔

کچھ سال قبل ڈاکٹر بوکرٹی واشنگٹن کا انتقال ہوگیا تاہم انکے قائم کردہ نارمل انڈسٹریل انسٹی ٹیوٹ ٹسکیگی اور اسکے زیر اہتمام دیگر ادارے تاحال برقرار ہیں اور شیدیوں کی خدمت میں مصروف عمل ہیں۔

(My Magzine، لندن، مارچ 1941 اور "اخبار تعلیم" حیدرآباد سندھ، جولائی 1943 سے)

باب۔ چہارم

ایام غلامی میں سندھ کے شیدیوں کی حالت زار

حضرت پیغمبر کریم ﷺ نے اپنی زندگی مقدس میں غریب غلاموں کے ساتھ جس پدرانہ محبت اور ہمدردی کا عملی مظاہرہ کیا وہ رفتہ رفتہ پورے براعظم ایشیاء میں دیندار مسلمان عملی طور پر دنیا کے سامنے لاتے رہے۔ اس ضمن میں کچھ صاحب ثروت لوگ کچھ کچی عمر کے غلاموں کو اپنالے پالک بناتے اور انکے ساتھ اپنی اولاد جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ ان میں سے کئی غلام اپنی قابلیت کی بنا پر خود بھی اعلیٰ درجے تک جا پہنچے۔

ایسے خوش نصیب غلاموں میں سے کچھ کے کارنامے تاریخی کتب میں جا بجا ملتے ہیں، مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کے آزاد کئے ہوئے شیدی غلام حضرت بلالؓ پیغمبر ﷺ کے پیاروں اور معزز اصحابین میں سے سے ایک تھے۔ حضرت علیؓ کا وفادار غلام قنبر، غزنی کے بادشاہ الپتگین کا ترک غلام سبکتگین جو بعد ازاں غزنی کا بادشاہ ہوا، محمود غزنوی کا چہیتا شیدی غلام ایاز، محمود غوری کا ترک قطب الدین جو دہلی کا پہلا مسلمان بادشاہ ہوا، قطب الدین کا ترک غلام التمش جو دہلی کا بادشاہ ہوا، رضیہ سلطانہ کا محبوب سپہ سالار شیدی غلام یاقوت، علاؤالدین خلجی کا نامور سپہ سالار شیدی غلام ملک کافور، احمد نگر کے نظام شاہی بادشاہ کا سپہ سالار شیدی غلام ملک قنبر، بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہوں کے جاں نثار سپہ سالار شیدی غلام دلاور خان اور اخلاص خان، سندھ کے آخری کلہوڑو حاکم عبدالنبی کا قلعہ دار

شیدی غلام یاقوت، جس نے اپنے سینے پر گولی کھا کر بھی خزانے کی چابیاں بلوچوں کے حوالے نہیں کیں اور سندھ کے آخری تالپور حکمران میر نصیر خان اور میر شیر محمد خان کا دلیر فوجی اہلکار ہوش محمد وغیرہ۔

جو شیدی غلام سندھ میں فروخت ہو کر آئے، ان میں ایسے خوش نصیب غلام جو اپنے مالکان کے پاس لے پالک بن کر رہے ہوں اور سکون کی زندگی گزاری ہو انتہائی کم تھے، ورنہ عام طور پر ان بے چاروں نے اپنے وطن سے نکالے جانے سے لیکر قید حیات سے نجات پانے یا آزاد کئے جانے تک انگنت اقسام کی تکالیف اور عذاب برداشت کئے۔ کئی پیرانہ سال بزرگ اپنی اولاد کو غلامی کے دنوں کے جو مظالم بیان کرتے تھے انہیں لکھنے کی نہ زبان میں طاقت ہے اور نہ ہی قلم میں۔

ایک بزرگ کا کہنا تھا کہ انہیں جھنگبار (زنجبار) سے لانے والا عرب سوداگروں کا بحری جہاز جب مسقط کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو ان میں سے کئی ایک تو بیمار ہونے کی وجہ سے دوران سفر ہی سمندر برد کر دیے گئے تھے جبکہ کئی ایک کو بندرگاہ پہنچنے پر دم مرگ ہونے کی وجہ سے ساحل پر پھینک دیا گیا، باقی بچ جانے والے مردوں کو تخت پر ریشمی گدے بچھا کر بیٹھے ہوئے ایک تاجر کی کوٹھی پر منتقل کیا گیا۔ اس جہاز پر سوار شیدی عورتوں اور بچوں کو کہاں لے جایا گیا، وہ معلوم نہیں ہے، غلاموں کی گنتی کے بعد انہیں تاجر کے حکم پر ایک گودام میں بند کیا گیا جو کہ کھجور کی ٹہنیوں سے بنا ہوا تھا جس میں سینکڑوں کی تعداد میں شیدی غلاموں کو بند کیا گیا۔ ہر روز علی الصبح وہ تاجر اپنے دو چار کارندوں کے ساتھ وہاں آتا اور سات آٹھ مضبوط اور طاقتور غلاموں کو علیحدہ کر کے انکے بازو پیچھے کی جانب باندھ کر انہیں احاطے میں اکڑوں بٹھاتا، اسکے ملازم لوہے کی مضبوط لمبی سلاخیں لیکر آتے، جنکی انیاں تیز اور باریک ہوتیں، یہ سلاخیں ان غلاموں کے سر میں اس طرح اتاری جاتیں کہ وہ آر پار ہو جاتیں، ہر ایک سلاخ کے ساتھ ایک غلام کو سیخ کباب کی طرح ٹانگ دیا جاتا۔

وہاں پر لوہے کی بڑی بڑی دیگچیاں چولہے پر چڑھی ہوئی ہوتی تھیں جن میں پانی جیسی کوئی چیز ہوتی، ان دیگچیوں کے دہانے پر غلاموں کے سروں والی سلاخیں رکھی جاتیں جبکہ نیچے تیز الاؤ جلایا جاتا۔ انکی لاشوں سے جو چربی دیگچیوں میں جاتی اس سے کوئی دوائی تیار کی جاتی۔ کہا جاتا تھا کہ

امیر کبیر لوگ یہ دوائی انتہائی مہنگے نرخوں پر حاصل کرتے تھے۔

سینکڑوں غلام اس قتل گاہ میں قید تھے جنہیں قتل کیا گیا۔ انسانی گوشت، کھجور اور پانی کے علاوہ کوئی چیز کھانے پینے کیلئے نہیں دی جاتی تھی۔ قید کیے گئے غلاموں کے پہریداروں میں سے اگر کوئی کبھی غلاموں پر رحم کھاتا تو انہیں انسانی گوشت کے بجائے نمک جیسی کوئی سفید چیز کھانے کو دیتا جس سے غلام کو دست شروع ہو جاتے اور صبح پہریدار تاجر کو اطلاع کرتے کہ اتنی تعداد میں غلام بیمار ہو گئے ہیں جس پر وہ انہیں منڈی میں نیلام کر دیتا۔

اس طرح کے مقتل سے آزاد ہونے والے غلاموں میں سے کئی ایک مختلف جگہوں پر فروخت ہو کر بالآخر آزادی کے زمانے میں ٹنڈو باگو ضلع بدین سندھ میں آ کر رہے۔ ان میں سے ایک کا نام نصیبو تھا، جس نے وہاں آ کر شادی بھی کی۔ آجکل اسکی تیسری نسل کی اولاد ٹنڈو باگو میں رہائش پذیر ہے۔

ٹنڈو باگو سے پانچ میل کے فاصلے پر ننگھ نامی گاؤں میں نصیر نامی ایک شیدی پر اسکا مالک ناراض ہو گیا۔ نصیر اتنا طاقتور اور مضبوط شخص تھا کہ دس بارہ لوگوں سے سنبھالا نہیں جا سکتا تھا۔ اسکے مالک نے بہلا پھسلا کر اسکو اپنے قابو میں کر کے، زنجیروں میں باندھ کر، ایک کنویں میں ڈلوا دیا اور پورے گاؤں کے لوگوں کو حکم دیا کہ اس پر اُس وقت تک پتھر پھینکے جائیں جب تک وہ کنواں بند نہیں ہو جاتا، اس طرح یہ غلام زندہ درگور ہو گیا۔

اس حادثے کے کوئی ایک سال بعد ننگھ گاؤں میں کوئی وبائی مرض پھیل گیا جس کے نتیجے میں پورا گاؤں اُجڑ گیا۔ یہ وقوعہ 1840-41ء میں پیش آیا، کیونکہ کچھ بزرگ بتاتے ہیں کہ نصیر شیدی کے واقعے کے دو سال بعد انگریزوں نے سندھ فتح کیا جس کے نتیجے میں شیدی غلامی سے آزاد ہوئے۔

ایک بزرگ خاتون بتاتی ہیں کہ، دوران غلامی وہ جس مالک کے پاس تھیں وہ انتہائی چاہ کے ساتھ اپنا اونٹ پالتا تھا۔ صبح یا دوپہر کو جب بھی اونٹ اپنے ٹھکانے پر آتا تو اسکے چارے سے بھرا ہوا ایک مرتبان اس خاتون کے سر پر رکھا جاتا تھا تاکہ مالک کا اونٹ کھڑے ہو کر اپنا چارہ کھا سکے۔ سال

کے تمام دن چاہیے بارش ہو یا سردی اس عورت کو اونٹ کے پیٹ بھر جانے تک مرتبان سر پر رکھ کر کھڑے ہونے کا حکم تھا۔

اس خاتون کے پوتے تاحال ٹنڈو باگو کے گردونواح میں رہائش پذیر ہیں۔اونٹ کے گردن جھکا کر چارہ کھانے پر اُسے ہونے والی تکلیف کا تو احساس کیا گیا لیکن ایک غلام انسان کو سر پر مرتبان رکھ کر کھڑے ہونے سے جو تکلیف پہنچی ہوگی اسکا کس کو احساس!

سندھ میں رہنے والے تمام تر امیر لوگوں کے پاس شیدی غلام ہوتے تھے تاہم انکی بڑی تعداد بلوچوں،سیدوں اور پیروں کے پاس تھی۔جو خاندان شوقیہ طور پر شکار یا پہلوانی کے شوق میں غلام خریدتے تھے وہ اپنے غلاموں کی خوراک اور پوشاک کا بہتر اہتمام کرتے تھے، دیگر غلاموں سے سردی اور گرمی میں سخت مشقت لی جاتی۔جو غلام ہندو تاجروں کے ہاں تھے وہ انکی نرم دلی اور رحم دلی کی تعریف کرتے تھے۔تاہم یہ اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح زیادتیوں اور نفرت کا شکار امریکہ کے شیدی غلام تھے وہ صورتحال سندھ کے شیدی غلاموں کو درپیش نہیں تھی۔

اگر کوئی مفرور غلام ہاتھ آتا یا جس غلام کے فرار ہونے کا خدشہ ہوتا تو اسکو دن میں سزا کے طور پر اور رات کو حفاظت کے طور پر مختلف طریقوں سے باندھا جاتا تھا۔

غلامی کے دور میں اگر کوئی شیدی اپنے مالک سے فرار ہوتا تو کسی شخص کو نظر آنے پر وہ اُسے اپنا غلام بنا دیتا تھا؛ اگر کوئی رحم دل مالک کسی غلام کو آزاد کر کے اُسے آزادی کا پروانہ دے دیتا تھا تو پھر ایسے غلام کو کوئی بھی پکڑ نہیں سکتا تھا۔غلامی میں قید شیدی جب کسی آزاد شیدی کو دیکھتے تو اس کو مبارک باد دیتے ہوئے اپنی غلامی پر آنسو بہاتے۔

کئی مالک اپنے غلاموں کی اپنے ہاں موجود خادماؤں سے شادیاں کراتے اور انکے ہاں پیدا ہونے والے بچوں کو اپنا غلام بناتے۔اس طرح وہ غلاموں کی خریداری پر خرچ ہونے والی رقم بچا لیتے۔

دو وقت کی روٹی اور جسم پر کپڑوں کے علاوہ کسی غلام کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔کسی مالک سے فرار ہونے یا آزادی کا پروانہ ملنے کی صورت میں ایسے کسی غلام کو اس وقت تک کوئی دانہ پانی نہیں ملتا جب تک وہ کسی کے ہاں غلام یا ملازم نہیں ہو جاتا۔

باب پنجم:

آزادی کے ایام میں سندھ کے شیدیوں کی صورتحال

ابتدائی صورتحال:

1843 میں جب سندھ انگریز سرکار کے زیر تسلط ہوئی تو نئے قواعد و ضوابط کا اعلان کیا گیا۔ان میں سے ایک ابتدائی اعلامیے کے مطابق، "غلام فروخت کرنے والے اور رکھنے والے قانون کی نظر میں مجرم سمجھے جائیں گے"۔اس اعلان کے بعد پورے سندھ میں شیدی غلام مرد، عورتیں اور بچے آزاد ہوئے۔

عام آزادی ملنے کے بعد کئی ایک شیدی تو اپنے طور پر کوئی کام کاج کرنے لگے جبکہ کچھ اپنے سابقہ مالکان کے پاس غلاموں کے بجائے اُجرتی ملازم کے طور پر کام کرنے لگے۔بلا کسی جرم دیس سے نکالے گئے ان بے کس غلاموں کو اپنے وطن اور عزیز و اقارب کو بھول جانا پڑا اور انہوں نے آزادی ملتے ہی ایک دوسرے کو اپنا عزیز و رشتہ دار سمجھ کر گلے لگایا۔بڑے شہروں اور دور دراز کے گاؤں دیہات میں ایک دوسرے کے ہاں غمی خوشی کے مواقع پر آنا جانا شروع کیا، آپس میں شادیاں کرنے لگے۔

اگر کوئی نو آزاد شیدی بھٹکتا ہوا کسی شیدی گاؤں یا آبادی میں پہنچتا تو تمام تر شیدی مل کر اسکی دلجوئی کرتے اور اسکے روزگار کا بندوبست کرتے اور اپنی برادری میں شادی بیاہ کرا دیتے۔

دو تین گاؤں کے شیدی اک جگہ جمع ہو کر اپنا رہنما مقرر کرتے (1) جمعدار یعنی معزز شخص یا پٹیل، (2) خلیفہ یا کوٹار (3) وزیر (4) قاضی (5) چھڑی دار۔ جمعدار کے فیصلے کو ہر شیدی بلا کسی چوں چرا کے مانتا اور اسکی بات پر کوئی فریق اعتراض نہیں کرتا۔ جمعدار کی غیر موجودگی میں خلیفہ کوئی فیصلہ وزیر اور قاضی کے مشورے سے کرتا تھا۔ برادری میں تقسیم ہونے والی کوئی چیز جمعدار کی موجودگی میں خلیفہ تقسیم کرتا تھا۔ "مکان" (عبادت، تفریح اور فیصلے کرنے کی جگہ) کا انتظام خلیفہ کے پاس ہوتا تھا۔

شادی یا غمی کے وقت پوری برادری کو "مکان" میں یا کسی بھائی بند کے گھر پہنچنے کی اطلاع چھڑی دار دیتا تھا۔ تقاریب میں کس کو کہاں بٹھا کر کھانا کھلانا ہے یا کس کے ہاں کھانا بھیجنا ہے کا فیصلہ چھڑی دار کرتا تھا۔ برادری کے فیصلے وہ آپس میں بیٹھ کر کرتے تھے اور اگر کوئی برادری کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا تو اُسے برادری سے خارج کر دیا جاتا۔ چونکہ یہ آزادی کے بعد کا ابتدائی دور تھا اس لئے ہر شیدی کو پختہ یقین تھا کہ اگر کوئی سچا ہمدرد ہو سکتا ہے تو وہ فقط سیاہ چمڑی اور گھنگھرالے بالوں والا ہی ہو سکتا ہے پھر چاہے وہ کہیں کا بھی ہو اس لئے برادری سے خارج کیا جانا ان کیلئے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔

غلامی کے دنوں میں جو کام شدیوں کو بلا معاوضہ کرنا پڑتے وہ اب انکے لئے معاوضے کا باعث بن گئے۔ کاشتکاری، بڑھئی، لوہے کے اوزاروں، کپڑوں کی دھلائی یا وزن اُٹھانے کا کام، غرض کے محنت کے ہر شعبے میں شیدی نظر آنے لگا۔ وہ دو چار دن مسلسل کام کرتے تو آنے والے کچھ دن اپنے جیسے شیدیوں کے ساتھ گزارتے، ایسے بہت کم شیدی ہوں گے جو سماجی میل جول کے بجائے صرف کمانے میں مصروف ہوتے۔

مسینڈ و یا مگرمان:

آزادی کے دنوں میں جہاں شیدیوں کے پندرہ بیس گھر قریب ہوتے، وہ اپنے آبائی دیس کا ایک ساز تیار کرتے، جسکو "مسینڈ و یا مگرمان" کہا جاتا تھا۔ مسینڈ و آزاد ہونے والے

شیدیوں کیلئے وطن کے فراق کی آگ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے کی طرح تھا۔ مسینڈ و بجاتے ہوئے اور اس پر کھیلتے ہوئے، شیدی جو زبان استعمال کرتے وہ خود ہی سمجھتے تھے، سندھ کا کوئی بھی مقامی فرد اسکو سمجھنے سے قاصر ہوتا، اسکے باوجود انکے ساز و آواز میں ایسی تاثیر تھی کہ ہر کوئی اپنا کام کاج چھوڑ کر بے اختیار شیدیوں کے اس ہجر و فراق کے جشن میں شریک ہو جاتا۔

عربی زبان جاننے والے یقین کے ساتھ کہہ سکیں گے کہ مسینڈ و پر یا اس سے متعلقہ دیگر سازوں کو بجاتے ہوئے شیدی جو زبان بولتے تھے یا وہ عربی ہے تاہم مختلف زبانوں کی آمیزش کی وجہ سے وہ درست تلفظ ادا نہیں کرتے۔ مسینڈ و بجاتے ہوئے وہ خدا تعالیٰ، رسول کریم ﷺ اور انکے اصحابہ کی تعریف کے ساتھ اپنے وطن اور وہاں کے لوگوں کو بھی یاد کرتے ہیں۔ کسی وقت غلامی کے عذاب یاد کرتے روتے تو کسی وقت اپنی آزادی پر خوشی کا اظہار کرتے، تو کسی وقت ایک دوسرے کا من بہلانے کیلئے طنز و مزاح کا سہارا لیتے، کچھ شیدی اپنی اولاد کو ان باتوں کا مطلب سندھی زبان میں بھی سمجھاتے تھے۔

مسینڈ و یا مگرمان ایک جانب وطن اور ہم وطنوں کے فراق کے زخموں پر مرہم تھا تو دوسری جانب شیدیوں کی قومی ہم آہنگی اور محبت کو مضبوط کرنے کا حامل تھا، ہر شیدی اس ساز پر کھنچتا چلا آتا تھا۔ پوری رات اس کے گرد رقص کرتے ہوئے شیدی مرد و عورت تھکتے نہیں تھے بلکہ صبح پہلے سے زیادہ ترو تازہ اپنے کام پر جاتے تھے۔ کوئی شادی بیاہ ہو تو دور دراز کے شیدی صرف مگرمان کی کشش میں بھی چلے آتے تھے اور میزبانوں کی غریب اطوار کی دعوت کے روکھے سوکھے چاول کھا کر سگائی کے دو چار آنے بھی دیتے تو میزبان کے سارے اخراجات کا خرچہ نکل آتا۔

کسی بھی بزرگ کا عرس یا میلا ہوتا تو قرب و جوار میں رہنے والے شیدی اپنا مسینڈ و لیکر وہاں پہنچ جاتے تھے۔ اس کار خیر میں شرکت کے واسطے دور دراز کے شیدی بھی میلے میں شرکت کرنے آتے تھے۔

جب شیدیوں کو اپنا مکان تعمیر کرانا ہوتا یا دور دراز کے شیدیوں کو مدعو کرنا ہوتا تو مگرمان لیکر قرب

دجوار میں گداگری کرتے اور نقد رقومات اور اناج وغیرہ جمع کرتے ۔
برادری میں ہونے والے فیصلے عام طور پر شادی بیاہ کے مواقع پر ہوتے جس میں چار پانچ جمعدار اور دیگر معززین شریک ہوتے تھے۔
ابتدائی دور کے آزاد شیدی اپنی زندگی کے ایام مسکینی میں لیکن انتہائی بہادری اور تعظیم سے گزار گئے ہیں۔

موجودہ افسوس ناک صورتحال:

سندھ میں جو شیدی آزادی کے عام اعلان کے نتیجے میں آزاد ہوئے تھے، آج اُن میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔ آجکل سندھ میں موجود شیدی ان آزاد ہونے والے غلاموں کی تیسری یا چوتھی نسل ہیں۔
دور غلامی میں سندھ کی وہ مسلمان ذاتیں جو امیر کبیر یا بااثر تھیں، انکے ہاں شیدی غلام تھے، وہ تاحال جاگیروں، زمینوں اور املاک کے مالک تو ہیں، انکے باوجود زمانے کے اتار چڑھاؤ نے ان میں اس حد تک عمومی بے عملی اور بدانتظامی داخل کردی ہے کہ ان ذاتوں کے باشعور افراد اپنے لوگوں کی بہتری وفلاح کیلئے تگ و دو کررہے ہیں، سندھ کے آخری مسلمان حکمران تالپور بھی اس سے مبرا نہیں ہیں۔ انکی ایک زبردست کانفرنس دسمبر 1933 میں حیدرآباد میں منعقد ہوئی جس میں قانون ساز اسمبلی کے رکن میر بندہ علی تالپور نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ " آج ان بلوچوں کی کیا صورتحال ہے؟ معتبر خاندانوں کی توقیر خاک میں مل گئی ہے، ہر گھر میں نااتفاقی کا دور دورہ ہے۔ بھائی بھائی سے اور بیٹا باپ سے علیحدہ ہے، اتحاد والفت کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا البتہ شجاعت اور بہادری ہم میں تاحال موجود ہے لیکن افسوس! کہ ہم وہ بھی باہمی اتفاق کے خاتمے اور ایک دوسرے کی سرکوبی اور گھر اُجاڑنے میں استعمال کررہے ہیں۔ علمی خزانوں کو تو ہم گنوا ہی چکے ہیں، بدرسومات، بدعتیں اور بدرواج ہماری زندگیوں کا حصہ بن چکے ہیں۔"
مندرجہ بالا غیر متعلقہ بات درمیان میں لانے کا میرا مقصد دراصل یہ ہے کہ قارئین خود فیصلہ کریں کہ جب تقریباً نوے برس کے عرصے میں حکمران فریق کے حالات کی حقیقی تصویر یہ ہے تو پھر

آجکل کے شیدی، جن کے اجداد انکے غلام تھے، کس حال میں ہونگے۔
درحقیقت آجکل سندھ کے شیدیوں کی حالت انتہائی دردناک اور دل کو مجروح کرنے والی ہے، جو عیوب اور سقم دیگر اقوام کے افراد میں انفرادی طور پر نظر آتے ہیں وہ شیدیوں میں مجموعی طور پر نظر آئیں گے۔ یہاں فقط چار سقم پر تفصیل سے بات کروں گا جو کہ تمام برائیوں کی جڑ ہیں (1) نفاق (2) جہالت (3) غربت (4) بدتہذیبی۔

1: نفاق:

آزادی کے اولین دور میں خالص شیدی زیادہ تھے جبکہ مخلوط النسل شیدی بہت کم تھے اور وہ برادری کے احکامات کے پابند ہوتے تھے۔ دن بدن ان مخلوط النسل شیدیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جن کے ننھیال شیدی تو ددھیال (عالم آشکار یا مخفی) بلوچ، سید، پیر اور دیگر ذاتوں سے تھے۔ آجکل اگر سندھ کے شیدیوں کا بغور جائزہ لیا جائے گا تو نجیب الطرفین شیدی بہت کم نظر آئیں گے۔
غیر ذاتوں کے ساتھ تعلقات میں اضافے کی وجہ سے آزادی کے ابتدائی دور کے قومی میلاپ اور محبت میں رخنہ آگیا اور رشتہ داریوں کے معاملات پر تنازعات پیدا ہوگئے۔ غیر لوگوں کی شہ پر شیدیوں میں غربت اور بے بسی کے باوجود گھمنڈ میں اضافہ ہوا اور برادری کے اصولوں سے انحراف میں اضافہ بھی۔
اب بھی بڑے شہروں میں کئی ایک گاؤں دیہات میں اصل روایتوں کے مطابق شیدیوں کے جمعدار، خلیفے، وزیر، قاضی اور چھڑی دار موجود ہیں تاہم پہلے جیسی محبت، اپنائیت اور فرمانبرداری ناپید ہے۔ نہایت عجیب بات ہے کہ کئی ایک مخلوط النسل شیدی خود کو شیدی کہلانے سے کتراتے ہیں حالانکہ سات نسلوں سے وہ شیدی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔
اس وقت بھی کئی شہروں اور گاؤں میں مسینڈے یا مگرمان موجود ہیں لیکن کئی شیدی اپنی عدم توجہگی اور ناسمجھی کی وجہ سے ان سے کوئی چاہ نہیں رکھتے بلکہ ریچھ، بندر، کتوں، نیولوں کے بہروپ اختیار کرکے نفرت انگیز کھیلوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ کچھ کو تو اتنا گھمنڈ ہے کہ مگرمان بجانے کو اپنی

توہین سمجھتے ہیں۔

پہلے دور دراز کے شیدیوں میں بھی اپنائیت تھی لیکن اب تو مشکل سے ہی ایسا کوئی خاندان ہوگا جس کے اندر اختلافات نہ ہوں۔

2: جہالت

آزادی کے ابتدائی دور میں حاصل ہونے والی آزادی کو شیدیوں نے غنیمت جانا۔ آپس میں محبت اور ہنسی خوشی میں گزارنے کی وجہ سے انہیں اپنے یا بچوں کے مستقبل کی کوئی خاص فکر نہیں تھی، البتہ اتنا ضرور کرتے تھے کہ اپنے بچوں کو کوئی ہنر وغیرہ ضرور سکھاتے۔ جن شیدیوں نے اپنی غلامی کا وقت کسی دیندار یا پڑھے لکھے مالک کے ہاں گزارا تھا انہوں نے اپنے بچوں کو مولویوں کے پاس تعلیم کیلئے بھیجا تو سہی مگر ان میں سے اکا دکا ہی اپنی تعلیم مکمل کر سکے۔

جو بچے اپنے والدین کو پورا وقت کھیل تماشوں میں مشغول دیکھتے ہوں، وہ تفریح کے ایسے مواقع چھوڑ کر کسی اُستاد کے پاس پڑھنے جائیں، یہ بات ناممکن نہیں تو بھی مشکل ضرور ہے۔

حکومت برطانیہ نے ہر خاص و عام کی تعلیم کیلئے سندھ میں سندھی اور انگریزی میڈیم اسکول قائم کئے تو شیدیوں کی تعلیم میں ایک بہت بڑی رکاوٹ وہ خود بین اور تن پرست امراء بھی تھے جن کا کم خرچ اور مفت خور شیدی ملازمین کے بغیر گزارہ ناممکن تھا۔

وہ سمجھتے تھے کہ شیدی جب تک جاہل اور ان پڑھ رہیں گے انکے زیردست ہی رہیں گے اور گزر بسر کیلئے انکے در پر پڑے رہیں گے۔ وہ چاہتے تھے کہ شیدیوں کے بچے تعلیم حاصل نہیں کریں ورنہ کل وہ انکے ناخواندہ یا نیم پڑھے لکھے بچوں پر فوقیت حاصل کرلیں گے۔ ایسے خود بین اشخاص کو شیدیوں کے تعلیم حاصل کرنے سے سخت نفرت تھی۔ ایسی کئی مثالیں میری نظروں کے سامنے آئی ہیں کہ جب سنا تو حیران رہ گیا کہ شیدی اپنے کسی بچے کو کسی مکتب یا اسکول میں داخل کراتا تھا تو دیگر لوگ آکر اُسے برغلاتے کہ اگر بچے پڑھ لکھ گئے تو بے ہمت، سست اور نکمے ہو جائیں گے۔ اس طرح کئی کم عقل شیدیوں نے اپنے بچوں کی تعلیم منقطع کرادی۔

نئے زمانے کی تعلیم کیلئے چاہیے خرچہ، مثلاً تعلیمی اشیاء کیلئے خرچہ، یونیفارم وغیرہ کا حصول۔ ان اخراجات نے بھی شیدی بچوں کی تعلیم میں رکاوٹ پیدا کی۔ ایسی صورتحال میں سندھ کے شیدی باقی ماندہ تمام لوگوں سے بالخصوص علم و ہنر میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

آزادی کے زمانے سے لیکر آج تک اگر کچھ شیدی دینی یا دنیاوی علوم میں کامیاب ہوئے ہیں تو انکی تعداد مجموعی تعداد کے مقابلے میں انتہائی قلیل ہے۔

3: غربت:

آزادی کے ابتدائی ایام کے دوران بھی شیدی غریب اور بے بس تھے تاہم اس غربت میں بھی ایک حُسن تھا کیونکہ اپنے گزر بسر کیلئے وہ کسی اور پر بوجھ نہیں بنتے تھے۔ غیر لوگوں سے تعلقات انتہائی کم تھے اس لئے جو بھی کماتے تھے آپس میں مل بانٹ کر زندگی گزارتے تھے۔ قرضہ لینے سے کوسوں دور بھاگتے تھے، اس لیے انکی غربت بلاشبہ وہ غربت تھی جس کیلئے حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔ "الفقر فخری" کہ غربت میرا فخر ہے۔

تاہم آجکل کے شیدیوں کی غربت اور بے بسی دیکھ کر انکے مستقبل پر رونا آتا ہے۔ ایک تو بھنگ، گانجے اور چرس کے استعمال نے ان میں کام چور لوگوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے، دوئم یہ کہ جوان لوگوں کو مشورہ دینے والا کوئی نہیں ہے کہ کس طرح کمائیں اور اس میں سے بچت کس طرح کریں۔ علاوہ ازیں انہیں اپنی محنت یا لین دین کے حساب کتاب کا کوئی اندازہ نہیں ہے، اس لئے اکثر و بیشتر ٹھگ دیئے جاتے ہیں۔

ایسے حالات کے باوجود اپنے اردگرد کے لوگوں سے مقابلہ کرنے کے گھمنڈ میں شادی بیاہ یا دیگر مواقع پر قرضہ حاصل کرنے کی عادت کا شکار ہو گئے ہیں، جس کی ادائیگی کیلئے انہیں پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

4: بدتہذیبی:

ایام غلامی میں کوئی شیدی جتنا فرمانبردار، نمک حلال، اور شریف ہوتا اتنا ہی اسکا مالک اس پر

مہربان ہوتا ،اس لیے آزادی کے ابتدائی ایام میں زیادہ تر شیدی تمیزدار اور وفادار تھے اور حتیٰ الامکان لڑائی جھگڑے سے دور رہتے تھے۔ ہمیشہ درگزر سے کام لیتے۔ آج بھی یہ رویہ کئی ایک شیدیوں میں موجود ہے تاہم انکی تعداد دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔ عمومی طور پر غربت کے باوجود تکبر کرنے اور دوسروں کی لڑائی جھگڑے اپنے گلے ڈالنے والوں کو تعداد زیادہ پائی جاتی ہے۔

جن شیدیوں نے آزادی کے بعد نمک حلالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سابقہ مالکان کے پاس کم خرچ ملازموں کی حیثیت سے رہنا جاری رکھا ،ان میں سے اکثر کی اولاد آج بھی اُن مالکان کے خاندانوں کی کفیل بنی ہوئی ہے اور یہ آجکل کے شیدیوں کی بدتہذیبی کی ایک اہم وجہ ہے۔

وہ سرسری طور پر کام کاج کر کے باقی ماندہ وقت فراغت کے مشاغل میں گزار دیتے ہیں۔ انکی مائیں، بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں امیر لوگوں کے گھروں پر محنت مشقت کرتی ہیں اور مردان خواتین کالا یا ہوا کھانا کھا کر بالم بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

خواتین کے کمانے کی وجہ سے اُن پر رائج نظم وضبط برقرار نہیں رہتا جو کہ سماجی بدتہذیبی کی ایک علامت ہے۔

ایسے مفت خور شیدی، جنہیں برائے نام کام کرنا پڑتا ہے اور جنہیں صبح شام کھانا مل جاتا ہے وہ پورا دن بھنگ اور چرس نہیں پئیں گے تو پھر اور کیا کریں گے؟ اس لیے آجکل چرس اور بھنگ کے استعمال میں شیدی سب سے آگے ہیں۔

کئی شیدی میلوں تماشوں کے چکر میں مہینوں گھروں سے دور رہتے ہیں اور اس دوران یہ تک نہیں سوچتے کہ انکی غیر موجودگی میں انکے گھر والوں بالخصوص خواتین کا کوئی پرسان حال بھی ہوگا کہ نہیں۔

ان کچھ گذارشات سے سمجھا جاسکتا ہے کہ شیدیوں میں جہالت کے ساتھ آجکل کی بدتہذیبی پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہوگا۔

باب۔ ششم

سندھ کے شیدیوں کی فلاح و بہبود

شیدیوں کی مندرجہ بالا ابتری کی تصویر دیکھ کر ہر کوئی یہی کہے گا کہ "ان تلوں میں تیل نہیں" لیکن قادر مطلق کی لامحدود طاقت اور بے انت رحم پر ہمیں پورا یقین ہے اور اسکے کلام پاک پر مکمل اعتقاد کہ جس میں کہا گیا ہے کہ، "لاتقنطو من رحمۃ اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم سے کبھی مایوس نہ ہونا۔

نا امیدی کفر ہے! بے اعتقادی اور بے ہمتی کا ہی نام نا اُمیدی ہے۔ دنیا میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ سچے اعتقاد، نیک نیتی اور ہمت کے ساتھ انسانوں نے کسی مشکل کام میں ہاتھ ڈالا ہو اور کامیابی نے انکے قدم نہیں چومے ہوں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا رب ہمیں اپنی فلاح و بہبود کے وسائل عطا کرے گا۔ فلاح بہبود کے خاص وسائل یہ ہیں: (1) تنظیم (2) تہذیب (3) تعلیم۔

تنظیم:

تنظیم سے مراد ہے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدرد بن کر، اتفاق رائے کے ساتھ رہنا۔ کوئی بھی قوم، اس وقت تک فلاح و بہبود اور ترقی کے فقط خواب ہی دیکھتی رہے گی جب تک اس میں تنظیم نہ ہو۔

شیدیوں کی تنظیم کیلئے یہ دو باتیں اہم ہیں (الف) برادری کا انتظام (ب) مسینڈو

الف: برادری کا انتظام واتحاد:

آزادی کے ابتدائی ایام میں شیدیوں کا یہ مسلم اصول تھا کہ اگر کسی شیدی کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی تھی تو تمام شیدی مذکورہ فرد یا کسی اور بااثر فرد کے پاس جا پہنچے تھے، اس طرح مظلوم کی کسی خرچے کے بغیر دادرسی ہو جاتی تھی۔ آج بھی شیدیوں کی اجتماعی فلاح و بہبود کیلئے پہلا ضروری اقدام برادری کے انتظام واتحاد کی بحالی ہوگا۔

جن جن گاؤں دیہات میں تاحال رسماً جمعدار، خلیفے، وزیر، قاضی اور چھڑی دار نسل در نسل آرہے ہیں، انہیں بیدار ہو کر اپنی برادری کے فرائض منصبی ادا کرنے ہونگے۔ جہاں جہاں یہ سلسلہ ٹوٹ گیا ہے وہاں اسکو نئے سرے سے جوڑنا ہوگا، درجہ بدرجہ قریبی برادریوں کو آپس میں مل کر برادرانہ ناطہ وسیع ومضبوط کرنا ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے وقت بوقت قریبی اور فاصلے پر قائم گاؤں دیہات کا سفر کرنا اور اپنی ذات برادری کے لوگوں کو متحد و منظم کر کے انہیں ہدایات دینا لازمی امر ہوگا۔

ب: مسینڈو یا مگرمان:

آزادی کے ابتدائی ایام میں ہمارے آباواجداد میں سے کچھ شیدی نماز روزے کے ایسے پابند تھے کہ غیر بھی انکی مثالیں دیتے تھے، اسکے باوجود وہ مسینڈو کے سچے عاشق تھے۔

دنیا بھر میں قدیمی اقوام کے پاس اپنا ایک آبائی ساز ضرور ہوتا ہے جو کہ وہ عبادت میں بھی کام لاتے ہیں تو دنیاوی خوشی کے اظہار کیلئے بھی۔ جس طرح عربوں کے پاس دف، پٹھانوں کے پاس رباب، انگریزوں کے پاس پیانو، گجراتیوں کے پاس ڈانڈی جبکہ کولہیوں کے پاس دھاک ہے اسی طرح شیدی مسینڈو (مگرمان) کو اپنا آبائی ساز سمجھتے ہیں۔ یہ شیدیوں کیلئے فقط ناچ گانے کا ہی ساز نہیں، بلکہ یہ انکا روحانی اظہار بھی ہے۔

اسلامی اصولوں کے مطابق مسینڈو چشتی طریقے کا ایک ایسا وجد اور حال آموز ساز ہے جس کے ادا

کیے گئے ذکر میں نہ صرف شیدیوں کی زبان مصروف ہوتی ہے بلکہ انکا دل اور سر سے پیر تک پورا جسم محو ہوتا ہے۔ اس ساز کی لے میں ایسا کوئی مقناطیسی اثر ہے کہ شیدی تعلق سے ذرہ برابر متعلقہ ہونے والا فرد جہاں بھی اسکی آواز سنے گا تو اسکے حضور حاضری دینے کیلئے بے چین ہو جائے گا۔

اسی وجہ سے مسینڈو شیدیوں کی قومی تنظیم کیلئے نہایت ہی کارآمد ساز ہے۔ ضرورت فقط اس امر کی ہے کہ جس ادب و پاک دامنی سے ہمارے بزرگ مگرمان پر ذکر اور تفریح کرتے تھے ویسی پاک دامنی کی جانب موجودہ شیدیوں کو بھی متوجہ کیا جائے۔

جو ذکر اور اشعار مگرمان میں پڑھے جاتے ہیں یا "موالیوں" میں گنگنائے جاتے ہیں وہ معنیٰ اور مضمون کے ساتھ شائع کئے جائیں۔ ہر ایک شیدی بچے کو ان سے متعارف کرانے کی کوشش کی جائے، اسی طرح قومی تنظیم اور تہذیب سے تعلق رکھنے والے نئے ذکر اور اشعار بھی مگرمان کے ذریعے سامنے لائے جائیں۔

شریعت کے وہ صاحبان، جو روحانیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، وہ کہتے رہتے ہیں کہ مگرمان پر ذکر اور تفریح "بدعت" ہے۔ ان صاحبان کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنی زوجہ محترمہ بی بی عائشہ کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر جس ساز کا عملی مظاہرہ دکھایا تھا، وہ شیدیوں کا مسینڈو ہی تھا۔

اس وقت کئی ایک شہروں اور گاؤں دیہات میں مگرمان موجود تو ہے لیکن شیدیوں نے اسکی قدر و قیمت نہ کرنے والوں کی طعنہ زنی کی بناء پر اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے اور ایسے ساز و آواز اختیار کر لئے ہیں جس سے ماسوائے وقتی سرور کچھ اور حاصل نہیں ہو سکتا۔

آج کے زمانے کے شیدیوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اس آبائی بیش بہا ساز کو قومی تنظیم و تہذیب کا موثر ہتھیار سمجھ کر استعمال کریں۔ چونکہ ہر شہر اور گاؤں دیہات میں مگرمان کے اکا دکا ماہرین ہی باقی بچے ہیں اس لئے نوجوان نسل کو مگرمان اور اس سے متعلقہ سازوں کی تربیت دینے کی اشد ضرورت ہے۔ شادی بیاہ یا کسی تہوار کے علاوہ ہفتے میں یا مہینے میں ایک مرتبہ مگرمان ضرور بجانا چاہیے۔

2: تہذیب

جس قدر قوم میں "تنظیم "ترقی کرے گی اتنی ہی "تہذیب" کو پھیلانے میں آسانی ہوگی۔ قومی تہذیب کو برقرار رکھنے کیلئے ذیل درج کوشش کرنی ہونگی:

1: بھنگ، چرس اور افیون کے عادی افراد کو دواؤں کے ذریعے اس بدعلت سے نجات دلانا۔

2: نوجوان نسل کو منشیات سے دور رہنے کیلئے بیدار کرنا۔

3: محنت مزدوری کر کے بال بچوں کی رہنمائی کرنا، جو بھی شیدی جس بھی کام دھندے کے قابل ہو اُسے وہاں لگانے کی بھرپور کوشش کرنا۔

4: عورتوں کی محنت ومشقت پر زندگی گزارنے والے مردوں کو اس عمل سے متنفر کرنا۔

5: لڑائی جھگڑوں سے دور رہنے کی ترغیب دینا۔

6: بے غیرتی اور بداخلاقی جیسی عادتوں کو مرحلہ وار ختم کرنے کی سعی کرنا۔

7: نماز اور روزے کی پابندی پیدا کرنا۔

3: تعلیم:

شیدیوں کی تعلیمی بہتری کیلئے مرحلہ وار ذیل درج کوششیں کرنا لازمی ہیں:

1: ہرایک شیدی اپنے بچوں کو تعلیم دلائے

2: اگر کسی شیدی کو اپنے بچوں کو پڑھانے میں کوئی دقت ہو تو اسکو دور کرنے کی کوشش کرنا

3: اسکول یا مکتب جہاں شیدی بچے تعلیم حاصل کرتے ہوں، اگر تعلیمی ساز وسامان کی ضرورت ہو تو اس میں آگے بڑھ کر ہاتھ بٹانا

4: خصوصی وظیفے مقرر کرنا یا کرانا جو سندھی اور انگریزی پڑھنے والے شیدی طلبہ کو انکی لیاقت اور قابلیت کی بنیاد پر دیئے جائیں

5: جن بچوں کو پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی نہ ہو، انہیں بنیادی تعلیم اور ریاضی سکھانے کے بعد کسی ہنر پر لگانا

6: نائٹ اسکول قائم کرنا تاکہ جو شیدی دن میں کام کاج کے بعد پڑھنا لکھنا چاہیں وہ استفادہ حاصل کرسکیں۔

اوپر بیان کیے گئے قومی فلاح و بہبود کی ضروریات اور وسائل کا حصول دو چیزوں پر منحصر کرتا ہے:

(1) عمومی ہمدردی (2) مالی امداد

ہمیں ایمانداری اور جانفشانی سے بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ جہاں جہاں خدا ترسی اور دینداری کا اثر ہوگا، وہاں امید ہے کہ ہمارے ساتھ مکمل ہمدردی اور مالی امداد کی جائے گی۔

1: برادری کے افراد کے نام:

پیارے سندھ کے باسی شیدی بھائیو اور بہنوں! دنیا کو دیکھو کہ کس طرح ہر ایک قوم غفلت کی نیند سے بیدار ہو رہی ہے، کس طرح ہر قوم اپنی آنے والی نسلوں کی فلاح و بہبود کیلئے تگ ودو کر رہی ہے۔ بلوچ، سید، پیر وغیرہ تو دور کی بات بھنگی اور چمار بھی اپنی بہتری کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ پیارے بھائیو اور بہنوں! آپ لوگ بہت سو لئے، اب جاگنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ اپنی برادری میں نااتفاقی پر نظر دوڑاؤ، اپنی بےعملی اور مسکینی کو دیکھو اپنی حالت اور اعمال کو دیکھو۔

شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ،

" گر از بساط زمین عقل منعدم گردد
بخود گمان نبرد ہیچ کس کہ نادانم"
(اگر عقل زمین پر ہوتی تو تمھاری
تو بھی خود کو بے عقل نہیں سمجھتا)

اس طرح شاید آپ بھی اپنے من میں سمجھتے ہوں گے کہ "ہم میں کون سی کمی ہے؟ ہم عقل مندی سے زندگی گزار رہے ہیں،"

اس طرح تو خلاء میں قلابازیاں کھاتا کوئی کیڑا بھی سوچتا ہے کہ اس جیسا کوئی دنیا بھر میں نہیں ہے۔

جن اقوام کے پاس ہمارے آباء اجداد غلام تھے جن میں سے کئی ایک آج بھی بڑی املاک کے مالک ہیں، بھی خود کو آج کی تعلیم وتہذیب میں غیر ترقی یافتہ سمجھ رہے ہیں وہاں ہماری بساط اور اوقات ہی کیا؟

پیارے بھائیو اور بہنوں !یقین جانو کہ ہم تمدن (گزر بسر کی صورتحال)،تہذیب (اخلاقی بلندی) اور تعلیم میں سندھ کے باقی تمام لوگوں سے انتہائی پیچھے ہیں۔

اگر ہم اپنے اور اپنی اولاد کے موجودہ حالات کو محسوس نہیں کریں گے تو پھر ہم انسانی روح سے محروم گوشت پوست کے جاندار ہی کہلائیں گے۔

ہمارے امریکی شیدی بھی عام آزادی کے بعد جب آپس میں ہم خیال ہوئے اور مرد اور خواتین مل کر اپنی بہتری کیلئے تگ ودو کرنے لگے تو خدا تعالیٰ کی مہربانی سے کئی غیر اقوام کے خداترس افراد بھی انکے ساتھی بنے، آج وہ تہذیب وتعلیم کی وجہ سے بہتر حالات میں ہیں۔ہم بھی اگر اپنی بہتری اور ترقی کی بات کریں گے تو یقیناً اور لوگ بھی ہمارے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے۔

ہمیں اپنی بہتری اور فلاح کیلئے تین باتیں مطلوب ہیں، (1) تنظیم (برادری کا معاہدہ) (2) تہذیب (اعمال میں بہتری) اور (3) تعلیم (حصول علم)۔تنظیم اور تہذیب دونوں کو حاصل کرنا ہمارے بس میں ہے، تنظیم اور تہذیب حاصل ہونے کیلئے جن اقدامات کو اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے، ان پر اگر ہم سب بھائی بہن عمل کرنا شروع کریں اور خدا تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہوئے صاف دل اور نیک نیتی کے ساتھ کام کرنا شروع کریں تو یقین جانیں کہ تعلیم کی بہتری کیلئے ہمارے کئی ہمدرد آگے بڑھیں گے۔

پیارے بھائیو اور بہنوں !خدارا غفلت چھوڑیں اور بیدار ہو جائیں کہ اپنے مستقبل کی فلاح کیلئے تن من دھن سے کچھ کرنے کا وقت آگیا ہے، اس بھاگ دوڑ کے دوران ہمیں جو تکالیف درپیش آئیں انہیں اپنا انعام سمجھ کر قبول کریں، جب ہم میں سے ہر ایک دل وزبان پر یہ وظیفہ ہوگا کہ:

"کام کرنے سے ہوں گا نہیں کبھی بیزار
گر مر بھی گیا تو ملے گی مجھے آفریں"

تب یقین کیجئے کہ فتح کے دروازے کھلنے میں دیر نہیں لگے گی۔خداوند کریم جل شانہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔(آمین)

2: تمام اہل اسلام کے نام:

پیارے مسلمان بھائیو!

ہم سندھ میں رہنے والے شیدی تمدن ،تہذیب اور تعلیم کے ضمن میں جس ابتر صورتحال کا شکار ہیں وہ آپ سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔سندھ کے مسلمانوں کا ایک علاج پذیر عضوہ مریض شیدی ہیں، اس مریض کو تندرست بنا کر مجموعی مسلمانوں کے وجود کو مکمل کرنا ہر ایک صاحب ایمان کا فرض بنتا ہے۔

یہ درست ہے کہ سندھ کے مسلمانوں کا ہر ایک گروہ غفلت کی نیند سے بیدار ہو چکا ہے اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا ہے، تاہم اس پر بھی کوئی اختلاف نہیں کہ ان میں سے ہر گروہ کے اکثر افراد کے پاس خدا تعالیٰ کی مہربانی سے اتنی جائیداد اور ملکیت ہے کہ ان میں سے اگر فقط دو تین افراد ہی آگے آجائیں تو انکے گروہ کی تمام تر ضروریات پوری ہو سکتی ہیں جبکہ ہمارے بیکس گروہ کے پاس اللہ کے نام کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہم اپنی سقیم برادری کی تنظیم ،تہذیب اور تعلیم کیلئے جو کوشش کرنا چاہیں گے اس میں آپکی ہمدردی حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔جہاں مالی امداد مطلوب نہ ہو، وہاں آپکی زبانی ہمدردی بھی ہماری مشکلات حل کر سکتی ہے۔

جن خاندانوں کے ہاں شیدی عورتیں اور مرد پڑے رہتے ہیں انکو اتنا تو سوچنا چاہیے کہ تہذیب سے عاری اس بے زبان ہجوم سے انکے اہل وعیال کو کیا ملے گا۔

پیارے مسلمان بھائیو!اگر آپ نے اسلام کے واسطے سے ہمارے بے کس ولاچار بھائیوں کی کوئی دادرسی نہیں کی تو پھر دوسروں کے ساتھ مقابلے میں ہم بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

ہم بے کس ہوں یا کنگال یا بے بس یا بدحال لیکن ہیں تو مسلمان اور الحمدللہ سچے دل کے ساتھ

مسلمان ہیں۔ دنیا میں خدا تعالیٰ کے جس برگزیدہ بندے نے ہم لاوارثوں پر رحم فرمایا وہ حضرت کریم ﷺ ہی تھے، تو پھر ہم اپنے اس ابتر حال کی وجہ سے حضرت محمد ﷺ کے آپ جیسے سچے عاشقوں میں ہمدردی کی اُمید کیوں نہ رکھیں۔

صرف چار خدا ترس عیسائی انسانیت کے لئے کھڑے ہوئے تو بے بس لوگوں کے سروں سے غلامی کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ اب جس کلام پاک میں فرمایا گیا ہے: انما المومنون اخوت (تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں) اور ھل جزائے الاحسان الا الاحسان (بھلائی کے عیوض خدا تعالیٰ کی جانب سے بھلائی کی صورت میں ضرور ملے گا) اس لئے حقانی کلام کو ماننے والوں سے ہم ہر قسم کی ہمدردی کی توقع رکھتے ہیں۔

ان اللہ یقیع اجر المحسنین

(بلاشک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کا بدلہ کبھی بھی ضائع ہونے نہیں دیتا)

3: حکومت پاکستان کے نام:

خداوند کریم جل شانہ کے لاکھ احسانات کہ آج ہماری پسماندہ قوم اس اسلامی حکومت کے زیر سایہ دم لے رہی ہے جو حکومت پاکستان کے روح افزا نام سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ جس طرح حکومت برطانیہ اور انگریز قوم نے ہماری بے بس ولاچار قوم کو غلامی کے عذاب سے آزادی بخشی، اسی طرح ہمیں بڑی اُمید ہے کہ حکومت پاکستان جو خالصتاً اسلامی حکومت ہے، وہ انشاء اللہ تعالیٰ ہماری اس پرسوز درخواست پر ضرور دھیان اور توجہ مبذول فرمائے گی اور ہمارے قوم کے دلی دردوں کے علاج کیلئے مناسب تدارک کرے گی۔

انگریز قوم میں گرنیول شارپ، تھامس کلارکسن، ولیم ولبرفورس اور سر تھامس فاؤویل بکسٹن جیسے انسانوں کے ہمدرد پیدا ہوئے ہیں۔ اس قوم اور انکی حکومت نے ہماری بے بس اور مظلوم قوم کو پوری دنیا میں غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرایا، ہماری بے کس و پسی ہوئی قوم کا انکے ساتھ دراصل کوئی دھری رشتہ نہیں تھا نہ ہی کوئی حاکم اور محکوم والا تعلق، صرف خدا ترسی اور انسانیت کے حوالے سے انہوں نے کروڑوں روپے خرچ کر کے ہماری بے حال قوم کے ساتھ ہمدردی کی۔

نہ صرف ہمیں غلامی کی ذلت سے آزاد کرانے کیلئے، بلکہ ہمارے آزاد ہوتے والے امریکی شیدی بھائیوں کی تہذیب، تعلیم اور حقوق کیلئے بھی انہوں نے لاکھوں روپے خرچ کئے۔ ہمارے امریکی بھائیوں کو حاصل شدہ تہذیب و تعلیم کا ہم سندھ کے شیدیوں کو عشیر عشیر تک نہیں ملا ہے، آزادی کے اعلان کو ایک صدی گزر چکی ہے۔

اس عرصے کے دوران تہذیب و تعلیم کے ضمن میں ہماری قوم جس ابتری کا شکار ہوئی ہے، اسکی حقیقت اس کتابچے میں بیان کی گئی ہے۔ سندھ خواہ پاکستان کے دیگر حصوں میں جو جو اقوام حکومت پاکستان کی رعیت ہیں ان میں سے ہر کوئی اپنی ترقی و بہتری کیلئے کوشش کر رہی ہے، ان کے پاس تو کچھ دولت و وسائل اور زمانے کی طاقت میسر ہے لیکن ہم شیدی بے کس و مجبور ہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ کوئی بھی قوم جو کسی ریاست کی رعایا ہو وہ اپنے حکمرانوں کی ہمدردی اور حمایت کے بغیر کوئی ترقی نہیں کر سکتی، ہماری قوم جو دیگر اقوام سے دھن دولت، تہذیب و تعلیم میں بہت پیچھے ہے، اسکے لئے حکومت پاکستان کی ہمدردی اور حمایت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

جب انگریز قوم و حکومت برطانیہ ہماری بے کس و مجبور قوم کی آزادی کیلئے خالصتاً انسانی ہمدردی کی بنیاد پر عمل کر چکی ہے تو ہم اپنی حکومت اسلامی پاکستان سے دلی محبت اور سچی وفاداری کے ساتھ اور خداوند کریم کے پاک کلام کی صحبت سے امید رکھتے ہیں کہ ہماری پس ماندہ قوم کی تمدن، تہذیب و تعلیم کیلئے ادب اور قانون کے دائرے میں جو کوششیں وقت بوقت ہوں گی، ان کو کامیاب بنانے میں وہ اسلام اور خدا کے پاک کلام کے زیر احکامات خدا ترسی اور رحم دلی کو استعمال کرتے ہوئے، کشادہ دلی کے ساتھ ہر طرح کی مدد کرنا فرمائے گی اور ہم جو اپنی موجودہ ابتر حالت پر خون کے آنسو رو رہے ہیں، وہ اپنی ہمدردی اور حمایت کے رومال سے پونچھنا فرمائے گی۔

4: معزز وزراء اور ارکین اسمبلی کے نام:

محترم صاحبان اور کونسل کے اراکین!

آپ جو ملک کے امیر خواہ غریب ہر ایک کی جانب سے منتخب نمائندے بن کر حکومت پاکستان کے نظام کو چلانے کیلئے ذمہ دار ہو، ان کی خدمت اقدس میں ہماری پس ماندہ قوم کی جانب سے یہ اپیل

ہے کہ جس صورت میں حکومت آجکل عومی بہتری کے کاموں کے ضمن میں آپکی باتوں پرغور کرتی ہےاورآپکی باتوں کووزن دیتی ہے،اس طرح کسی اور کی باتوں کواہمیت حاصل نہیں ہے۔

اس صورت میں اگرچہ آپ صاحبان کو باایمان مسلمان ہونے کی حیثیت میں مجموعی طور قبل ازیں استدعا کی جا چکی ہے تاہم یہاں آپ صاحبان کو ارکان عظام کی حیثیت میں دوبارہ ادب کے ساتھ گزارش کرتے ہیں کہ آپ صاحبان بھی ہماری بے حال قوم کی بہتری اور ترقی کیلئے آواز بلند کریں تو پھر انشاءاللہ ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔خداتعالیٰ اس بھلائی کے عیوض آپ صاحبان کو اجر دے گا۔

5:اخباری مدیران کے نام:

معزز مدیر صاحبان:

کسی بھی قوم کے مقاصد کے حصول کیلئے آجکل ذرائع ابلاغ جو کام کر سکتے ہیں وہ رونے دھونے ، چیخ و پکار کرنے سے حاصل ہونا ناممکن ہے۔ ہماری قوم کی دردناک صورت حال، جو آپ اس کتابچے سے پڑھ کر جان سکتے ہیں، اور ہم اُمید رکھتے ہیں کہ آپ اپنے حق پسند اور انسانیت سے پُر جذبے کو لازماً ہمارے ساتھ ہمدردی کرنے کیلئے تحرک میں لائیں گے۔ ہم آپ سے فقط قلم کی سخاوت کے مطلوب ہیں۔

آپ اپنے اخبارات کے ذریعے دربدر قوم کی پشت پناہی کے لئے جو بھی قلمی سخاوت کریں گے وہ ہمارے لئے آبِ حیات ثابت ہوگی۔

وقت بوقت جو مضامین یا صدائیں ہمیں اخبارات کے ذریعے پھیلانی ہوں گی، انہیں خاص رعایت کے ساتھ اپنے اخبارات میں شائع کرکے، آپ جو ہمدردی کریں گے وہ دولت کے انبار سے بھی زیادہ ہمارے لئے کارآمد ہوگی۔

خداتعالیٰ جل شانہ، اس بھلائی کیلئے آپ کو دنیا اور آخرت کے درجات بخشیں گے۔

6:تعلیمی امور پر بااختیار صاحبان کے نام:

تعلیمی امور پر بااختیار صاحبان!

آپ جو حکومت کی جانب سے محکمہ تعلیم کے نگران افسران، میونسپل اداروں کے اسکول بورڈ کے اراکین، چیئرمین، انتظامی افسران اور سپروائزر، الحمدللہ تمام ایمان کی سلامتی والے مسلمان ہو، کو ہماری باادب گزارش ہے کہ ہماری قوم جاہلیت کے صحرا میں بھٹک رہی ہے، اسکی فلاح و بہتری کیلئے اپنے اختیارات کے تحت رحم اور ہمدردی کی نظر کرنا فرمائیں۔

جلد ہم اپنی پس ماندہ قوم کیلئے تعلیم کی دان مانگنے کیلئے فقیری کشکول لیکر، آپ میں سے ہر ایک صاحب کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے، کیونکہ جب آپ کسی تعلیمی معاملے پر ہمدردی کا اظہار کریں گے تب ہی یہ معاملہ حکومت کے ہاں فوری پذیرائی حاصل کر سکے گا۔

حصہ دوئم

مسافر کی کہانی۔ خود اُسکی اپنی زبانی

باب اول

پہلی منزل۔ والد مرحوم کا بچپن میں سفر:

والد مرحوم کا زاد بود براعظم افریقہ کا مشرقی علاقہ زنجبار ہے، جہاں حبشی قوم کے عجیب و غریب قبائل رہائش پذیر ہیں، جن میں زمانہ قدیم سے جاہلانہ دستور تھا کہ جب دو قبائل کسی معمولی بات پر بھی آپس میں الجھتے تھے تو ان کے درمیان گھمسان کی لڑائی شروع ہو جاتی، پھر غالب فریق مغلوب فریق کے حراست میں لئے گئے مردوں، عورتوں اور بچوں کو باندی بنا کر، ساحل پر موجود عرب سوداگروں کے حوالے کرتے تھے، جو خاص طور پر حبشی غلام خریدنے کے لئے دریا کنارے خیمہ زن ہوتے۔ حبشی قبائل کے اس جاہلانہ دستور کے تحت والد مرحوم چھ سات برس کی عمر میں غلام بن کر مسقط آئے۔

مسقط میں شیخ حسین نامی ایک عرب جو غلاموں کی تجارت کرتا تھا، نے غلاموں سے بھری ہوئی ایک کشتی خریدی، جن میں والد مرحوم کے علاوہ دیگر مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ چونکہ والد مرحوم کے ساتھ نہ انکے والد تھے اور نہ ہی والدہ اس لیے انکے ساتھ بیتے جانے والے حالات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ اس کم عمر غلام کی خوش نصیبی تھی کہ شیخ حسین نے اُسے اپنے گھر میں کام کاج کیلئے گھریلو غلام بنا رکھا، اسکا ختنہ کروایا اور نام بلال رکھا۔

دوسری منزل:

بلال بمشکل دو برس شیخ حسین کے ہاں رہا کہ شیخ نے غلاموں کا ایک ٹولہ فروخت کیلئے سندھ روانہ کیا، اس ٹولے میں کم عمر بلال بھی شامل تھا۔ غلاموں کے اس ٹولے میں سے کوئی کہیں فروخت ہوا تو کوئی کہاں، جبکہ بلال کو ٹھٹھہ شہر کے ایک غلام علی نامی سنگتراش نے خرید لیا، جس نے بھی اُسے اپنے گھریلو کام کاج سے لگایا۔ اس وقت سندھ میں تالپور خاندان کی حکومت تھی۔

میر باگو خان تالپور، جو کلہوڑوں سے سندھ فتح کرنے کے وقت چار تالپور سپہ سالاروں میں سے

ایک تھے اور سندھ فتح کرنے کے بعد حکومتی امور میں حصہ دار بننے کے بجائے زیریں سندھ میں جاگیردار بن کر رہنے پر رضامند ہوئے اور ٹنڈو باگو نامی شہر آباد کر کے اپنے خاندان اور عملے کے ساتھ آکر رہنے لگے جس کے انتقال کے بعد اسکے بڑے بیٹے میر ولی خان تالپور نے ٹنڈو باگو میں اپنی نئی حویلی اور مہمان خانہ تعمیر کرانے کیلئے ٹھٹھہ سے سنگتراش بلائے تھے (1) ان سنگتراشوں میں غلام علی سنگتراش بھی شامل تھا۔ میر ولی خان کی حویلی اور مہمان خانے کا کام مکمل ہونے تک غلام علی سنگتراش اور کئی دیگر افراد اپنے خاندانوں سمیت وہاں رہائش پذیر ہوئے۔

باہر سے آنے والے ٹنڈو باگو میں عارضی طور پر باگو نہر کے کنارے پر خیمے لگا کر مقیم ہوئے تھے۔ غلام علی سنگتراش کے خاندان کے ہمراہ انکا غلام بلال بھی تھا جسکی عمر بمشکل دس برس تھی۔

تیسری منزل:

غلام علی سنگتراش ہر روز صبح سویرے اشیائے خورد و نوش کی خریداری کر کے، اپنی بیوی کو دیکر میر صاحب کے کام پر چلا جاتا تھا اور دوپہر کو کام کاج سے واپسی پر کھانا کھاتا۔ ایک دن اس نے مچھلی خرید کر اپنی بیگم کے حوالے کی جس نے اسکی کاٹ چھانٹ کر کے بلال کے حوالے کی کہ وہ جا کر نہر پر اسکی صفائی کرے۔ مچھلی دھونے کے دوران، وہ ہاتھ سے پھسل کر جا کر نہر میں جا گری۔

بلال نے روتے ہوئے آکر اپنی مالکن کو اسکا بتایا، اگرچہ وہ اس بچے کا انتہائی خیال رکھتی تھی لیکن اپنے شوہر کی تند طبیعت سے وہ واقف تھی کہ مچھلی کی ضیافت سے محرومی پر وہ بچے کا نہ جانے کیا حشر کرے گا۔

غلام علی کام کاج سے لوٹ آیا تو مچھلی کھانے سے محرومی پر آگ بگولہ ہو گیا اور بیوی کی منتوں کے باوجود اس نے معصوم بلال کو دو تین تھپڑ رسید کر دیئے اور اُسے بازار میں فروخت کرنے کیلئے چل پڑا۔

---

(1) میر ولی خان تالپور کی یہ نئی حویلی اس مقام پر تھی جہاں اب میر غلام محمد اینڈ لارینس مدرسہ ہائی اسکول کی عمارت واقع ہے میر ولی خان نے یہ حویلی 1806 میں تعمیر کرائی۔

رنگریز محلے کی بڑی گلی، جس کے وسط میں کھٹی برادری کی جامع مسجد قائم ہے میں مسجد کے برابر میں مشرقی سمت میں مخدوم حُر علی نامی ایک بزرگ کی حویلی تھی۔ مخدوم حُر علی (2) حویلی کے بیرونی دروازے کے پاس کسی شخص سے بات چیت میں مصروف تھے کہ دیکھا کہ غلام علی سنگتراش لڑکے کو گھسیٹتا ہوا لے جا رہا ہے جو کہ زار و قطار رو رہا تھا۔ معلوم کرنے پر انہیں پتہ لگا کہ وہ اس لڑکے کو فروخت کرنے کیلئے بازار لے جا رہا ہے۔ مخدوم کو ایک گھریلو ملازم کی ضرورت تھی، سو منہ مانگی قیمت ادا کر کے بچے کو اپنی حویلی لے آیا۔

مخدوم کی بیگم انتہائی نیک دل اور خدا ترس خاتون تھیں، جس نے بلال کو حوصلہ دیا اور اپنا لے پالک غلام بنا کر گھریلو کام کاج پر رکھ لیا۔ مخدوم خاندان کے پاس بلال کے دن پُرسکون انداز میں گزرنے لگے۔

مخدوم حُر علی کی کوئی اولاد نہیں تھی، انکی بیگم اپنے معصوم غلام بلال کو اپنے بچوں کی طرح رکھتی تھیں۔ مخدوم صاحب اور انکی بیگم نے چھوٹی عمر سے ہی بلال میں نماز اور ذکر کی عادت پیدا کی جو تادمِ مرگ جاری رہی اسکے علاوہ اسکو راہ و رسم کے تمام تر آداب بھی سکھائے گئے۔

ایک مرتبہ بلال سخت بیمار ہو گیا تو اسکی صحت یابی کیلئے حیلوں بہانوں کے ساتھ بیگم نے اپنے مخدوم کو بچے کا نام تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تو اسکا نام بلال سے تبدیل کر کے گلاب رکھا گیا۔

گلاب اپنی پوری ایمانداری اور جانفشانی سے مخدوم خاندان کی خدمت کرتا رہا اور جب جوان ہوا تو مخدوم حُر علی نے ایک نوجوان حبشی عورت خرید کر کے گلاب کے ساتھ اسکی شادی کرا دی۔ اس خاتون کا نام سلیمت تھا، اب حویلی سے باہر کے کام گلاب کے سپرد تھے تو اندرون خانہ کام سلیمت کے ذمے ہو گئے۔

---

(2) مخدوم اسماعیل سومرو، جن کا مقبرہ ماتلی تحصیل کے گاؤں الھامانی میں واقع ہے، کا تذکرہ "تحفۃ الکرام" میں بھی ملتا ہے، انکی اولاد بھی مخدوم کہلاتی تھی جبکہ انکے مرید خادم۔ مخدوم حُر علی بھی اس مخدوم خاندان سے تھے۔ ٹنڈو الہ یار اور زیریں سندھ کے پاتولی اور میمن انکے خاص مرید تھے، جو مخدوم بزرگوں کے انتقال کے بعد پیر پاگارا اور دیگر اکابرین کے مرید ہو گئے۔

چوتھی منزل۔آزادی:

1843 میں سندھ کی فتح کے بعد انگریزوں نے عام اعلان کیا کہ غلاموں کی خرید وفروخت غیر قانونی عمل ہوگا، اس لئے جن لوگوں کے پاس غلام یا کنیزیں ہیں وہ انہیں فوری طور پر آزاد کر دیں۔ اس اعلان کے تحت پورے ملک میں حبشی غلام آزاد ہو گئے۔ اسی اعلان کے تحت مخدوم حُرعلی نے بھی گلاب کو آزاد کر دیا اور انسانی ہمدردی کے تحت پڑوس میں اُسے ایک گھر بنوا کر دیا جہاں وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہنے لگا۔

اس نے اپنی بسر اوقات کے لئے تعمیراتی مزدور کا کام شروع کیا، جبکہ پرانے ناطے کی وجہ سے اکثر اوقات مخدوم حر کے ہاں بھی کام میں ہاتھ بٹاتا۔

مخدوم حُرعلی کے انتقال کے بعد اُسکی بیوی اور دیگر افراد ٹنڈو باگو سے نقل مکانی کر کے مخدوم گوٹھ منتقل ہو گئے۔ اس اُجڑے ہوئے گاؤں کے آثار آج بھی ٹنڈو باگو بتلھار روڈ پر موجود ہیں۔ اگرچہ اس گاؤں میں ایک مخدوم خاندان تاحال رہائش پذیر ہے لیکن ان میں اپنے بزرگوں جیسی خداترسی ناپید ہے۔

پانچویں منزل۔برادری کا مکھیا بننا:

سندھ میں انگریزوں کی حکومت قائم ہونے اور غلامی کے خاتمے کے بعد دیگر علاقوں کی طرح ٹنڈو باگو کے بھی تمام حبشی لوگوں نے اپنی جماعت قائم کی اور اپنے میں سے ایک کو اپنا رہنما بنایا جس کو جمعدار، دوسرا قاضی، تیسرا خلیفہ اور چوتھا چھڑی بردار کہا جاتا۔ برادری میں شادی بیاہ یا غمی کے ایام میں تمام تر انتظامات انہی کے سپرد ہوتے جبکہ برادری میں گھریلو تنازعات کے فیصلے بھی یہی لوگ کرتے اور قصوروار کو جرمانے وغیرہ کی سزا سناتے۔ یہ انتظام دیگر علاقوں کی طرح ٹنڈو باگو میں بھی تاحال قائم ہے۔

آزادی کے ابتدائی ایام میں ٹنڈو باگو کے حبشیوں نے اپنا پہلا جمعدار یا مکھیا مقرر کیا جس کا نام بھی گلاب تھا، انہیں بڑا گلاب جبکہ میرے والد کو چھوٹا گلاب کہا جاتا تھا۔ بڑا گلاب ایک نیک دل

درویش صفت شخص تھا جسکی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ میرے والد اسکی خدمت کرتے تھے۔ بڑے گلاب نے بستر مرگ پر علاقے کے معززین کی موجودگی میں وصیت کی کہ اُسکے انتقال کے بعد چھوٹے گلاب کو جمعدار بنایا جائے۔

بڑے گلاب کے انتقال پر ٹنڈو باگو اور اردگرد کے علاقوں کی حبشی برادری ٹنڈو باگو میں جمع ہوئی اور شہر کی برادری کے جمعدار کی پگڑی چھوٹے گلاب (میرے والد) کو پہنائی گئی، اس دن کے بعد نہ فقط حبشی بھائی بلکہ علاقے کے دیگر لوگوں نے بھی میرے والد کو مکھی گلاب یا جمعدار گلاب کہنا شروع کیا۔

چھٹی منزل۔دوسری شادی:

والد صاحب کے بقول سندھ میں انگریزی حکومت آنے کے وقت انکی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی اور اس حکومت کے آنے کے دو سال بعد انکی پہلی بیوی مائی سلیمت وفات کر گئیں۔ والد صاحب کے مائی سلیمت سے کل اٹھارہ بچے ہوئے تاہم وہ سب بچپن میں ہی چل بسے۔ سلیمت کا انتقال بھی زچگی کے دوران ہی ہوا۔

مائی سلیمت کے انتقال کے فوراً بعد بڑے گلاب جمعدار نے والد صاحب کی شادی بیگم نامی ایک غیر شادی شدہ لڑکی سے کرائی۔ اس بیوی سے والد مرحوم کے کل بارہ بچے ہوئے، جن میں سے اس وقت فقط میں (محمد صدیق مسافر) ہی زندہ ہوں۔

ساتویں منزل۔والد مرحوم کی آخری منزل:

آزادی حاصل کرنے کے بعد جس طرح ہر ایک حبشی کسی نہ کسی کام دھندے کے ساتھ لگ گیا، میرے والد بھی پہلے تو عمارتوں کا تعمیراتی کام کرتے رہے، پھر جلد ہی چاول پیسنے کے کام سے جڑ گئے جس سے زندگی کے آخری ایام تک لگے رہے۔ اس وقت ٹنڈو باگو میں چاول پیسنے کے دو کارخانے تھے جو کہ خواجہ برادری سے تعلق رکھنے والے افراد کے تھے۔ ان کارخانوں میں دو تین پتھر کی چکیاں تھیں جنکو پیروں سے چلانے کیلئے طاقتور افراد کی ضرورت ہوتی تھی، والد مرحوم کو

خداتعالیٰ نے ایسی جسمانی طاقت اور صحت بخشی تھی کہ انتقال سے قبل بیماری کے چار پانچ دنوں کے علاوہ انہوں نے کام سے کبھی بھی ناغہ نہیں کیا۔

والدمرحوم روزانہ فجر کے وقت نیند سے اُٹھ کر ذکر کرتے تھے، وہ پانچ وقت نمازی تھے جوکہ مخدوم حُر علی نے انہیں بچپن میں ہی عادت ڈال دی تھی۔ انکی عاجزی، سادگی اور ہمدردی کا ذکر شہر کے لوگ ایک عرصے تک کرتے رہے۔ والدمرحوم کا 9 ربیع الثانی 1305 ہجری (بمطابق 1888) کو بروز جمعہ فجر کے وقت انتقال ہوا، انہوں نے اپنے ترکے میں سات اولادیں چھوڑیں۔ پانچ بیٹیاں (جن میں سے ایک شادی شدہ) اور دو بیٹے جن میں سے ایک راقم الحروف نیازمند (مسافر) اور دوسرا ابراہیم۔ والدمرحوم کی انتقال کے وقت عمر اسی برس سے زائد تھی، میں اس وقت نو برس کا جبکہ میرا بھائی ابراہیم دو برس کا تھا۔ پانچ بہنوں میں سے چار مجھ سے بڑی تھیں جبکہ ایک میرے بعد پیدا ہوئی۔ اس وقت ان سات بچوں میں سے فقط میں اپنی اولاد کے ساتھ زندگی کی منازل طے کر رہا ہوں۔

باب۔ دوئم

موجودہ مسافر

پہلی منزل۔ بچپن اور ابتدائی تعلیم:

میری ولادت 8 محرم الحرام 1236 ہجری کو ہوئی۔ اسکول میں داخلہ کے وقت ان دنوں کے ہیڈ ماسٹر نے ہجری سال اور عیسوی سال کا تقابل کر کے رجسٹر میں میری پیدائش کی تاریخ یکم اپریل 1879 درج کی۔ میں جب چھ برس کا تھا تو والدمرحوم نے مجھے قرآن شریف کی تعلیم کیلئے مکتب میں بٹھایا، جوکہ ہمارے محلے میں ہی تھا۔ والدہ مرحومہ کی ہمت بھری زندگی اور میرے سگے ماموں حاجی عارف جن کی رنگائی کے کام کی ایک بہت بڑی دکان تھی، کے پیار و ہمدردی کی وجہ سے مجھے اپنے والدمرحوم کی وفات کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

والدمرحوم کے انتقال کے بعد اُن کے سوئم کے دن شہر اور اردگرد کے بزرگ اور جوان جبشی بھائی میرے ماموں کی دکان پر جمع ہوئے اور مجھے بھی مکتب سے بلوایا گیا۔ ایک بزرگ نے میرے سر پر ایک نئی سفید پگڑی باندھی اور موجود لوگوں نے مجھ پر پیسے نچھاور کیے اور ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے۔ میں تو فقط نئی پگڑی کی وجہ سے خوش تھا جبکہ اس پوری کارروائی کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ بعدازاں وہ بزرگ شخص، جس نے اپنے ہاتھ سے مجھے پگڑی باندھی تھی، جسکو ہم اپنے بچپن سے "نانا" بلاتے تھے مجھے محفل سے اُٹھا کر نئی پگڑی سمیت گود میں لیکر ہمارے گھر والدہ کے پاس لے آئے، اور اُنہیں بتانے لگے "اماں بیگم! تمھیں مبارک ہو، گلاب جمعدار کی پگڑی اس چھوٹے صدیق کو پہنائی گئی ہے اور جب تک یہ بڑا ہو اور عقل مند بنے، تب تک برادری کے کام کاج اور فیصلوں کی ذمہ داری تمھارے بھائی عارف کے حوالے کی گئی ہے۔" اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ برادری کے افراد نے والدمرحوم کی جمعدار والی پگڑی مجھے پہنائی ہے۔

مکتب میں قرآن شریف پڑھ کر مکمل کرنے کے بعد، اس وقت کے دستور کے مطابق میں نے

ابوالحسن کی سندھی کا سبق حاصل کیا۔ایک سال کے بعد یکم اگست 1893 کو ماموں حاجی عارف مرحوم نے مجھے مکتب سے حافظ صاحب کی اجازت کے ساتھ نکال کر سندھی اسکول میں داخل کرایا،اس وقت میری عمر چودہ برس کے لگ بھگ تھی۔

ٹنڈو باگو کے سندھی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ڈیپارجہ تحصیل مورو کے ایک سکھ ویسا کھ سنگھ تھے جو انتہائی صاف دل اور تعصب کے بغیر شخص تھے۔انہوں نے مجھے پہلی کتاب اور دوسری کتاب کے کچھ اسباق پڑھائے جو کہ میں بلا جھجک پڑھ گیا،بعدازاں املا کے کچھ الفاظ تحریر کرائے جس ضمن میں بھی میں نے انہیں مطمئن کیا تو انہوں نے مجھے دوسری جماعت میں داخل کر کے صرف ریاضی سکھانے پر خصوصی توجہ دی۔دسمبر 1893 میں اسکول کے سالانہ امتحانات ہوئے جن میں دوسری جماعت میں میرا پہلا نمبر آیا۔

جب میں جنوری 1894 میں تیسری جماعت میں داخل ہوا تو ویسا کھ سنگھ کا تبادلہ ہو گیا اور انکی جگہ ٹنڈو الہ یار تحصیل کے مولچند لعل چند ہیڈ ماسٹر تعینات ہوئے،جو صاف دلی اور غریب نوازی میں ویسا کھ سنگھ سے بھی قدرے زیادہ تھے۔دسمبر 1894 کے سالانہ امتحان میں انہوں نے مجھ سے تیسری اور چوتھی جماعت کا مشترکہ امتحان لیا جو کہ میں نے اول نمبر سے پاس کیا۔دسمبر 1895 میں میں نے پانچویں جماعت پاس کی۔بعدازاں تحصیل ٹنڈو الہ یار سے ہی تعلق رکھنے والے ایک اور سینئر اُستاد تھجرام (3) آئے،جو نہ صرف سندھی ادب کے عالم تھے بلکہ فارسی بھی انتہائی خوب جانتے تھے۔ان صاحب نے مجھے چھٹی جماعت میں چار روپے تنخواہ پر اسکول میں "طالب علم استاد"(Pupil Teacher) کی اسامی پر مقرر کیا اور ورنیکولر فائنل امتحان کی تیاری کرانے کے ساتھ فارسی کا سبق بھی دینا شروع کیا۔

ستمبر 1896 میں میں ورنیکولر فائنل امتحان میں شریک ہوا اور خدا تعالیٰ کے فضل سے اس میں کامیاب ہو گیا۔

---

(3) یہ وہ صاحب ہیں جنکی تیار کی ہوئی سندھی ڈکشنری "تھج کوش" سندھی ادیبوں میں انتہائی مقبول ہے۔

دوسری منزل۔ابتدائی ملازمت:

ورنیکولر فائنل امتحان میں پاس ہونے کی تسلی کے بعد میں نے تھجرام صاحب کے توسط سے ضلع کے ڈپٹی ایجوکیشن انسپکٹر کو ملازمت کیلئے درخواست دی،جس پر ٹنڈو آدم کے سندھی اسکول میں نائب اُستاد مقرر کیے جانے کا حکمنامہ جاری ہوا۔تھجرام صاحب کا کہنا تھا کہ،"فوری طور پر تو ان احکامات کے تحت تقرر کی جگہ ضرور جانا چاہیے،بعد میں تبادلہ کرانا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔"اس ہدایت کے تحت میں یکم فروری 1897 کو ٹنڈو آدم پہنچ کر ملازمت کیلئے حاضر ہوا۔خوش قسمتی سے وہاں کے ہیڈ ماسٹر مرحوم آخوند عبدالرحیم حیدرآبادی تھے،جو مشہور خوش طبع،با رنجیس اور خاندانی علم دوست فرد تھے،جنہوں نے پنشن کے بعد حیدرآباد سے "حمبفرزٹلی" نامی ایک ماہنامہ جاری کیا،جس کی نزاکت اُس وقت کے علم دوست افراد فراموش نہیں کر سکے۔

اسکول کے قریب اساتذہ کی رہائش کیلئے جو خانگی جگہ تھی اس میں دو پردیسی نائب اساتذہ پہلے ہی ہیڈ ماسٹر کے ساتھ رہائش پذیر تھے،مجھے بھی ہیڈ ماسٹر نے اس جگہ میں اپنے ساتھ رہنے اور مشترکہ طور پر کھانے پکانے کی اجازت دے دی۔

وہاں کھانے پینے اور گپ شپ میں وقت تو بہت اچھا گزر رہا تھا لیکن تھجرام صاحب نے فارسی کی جو چاشنی زبان سے لگائی تھی اس کے زیر اثر "دووایہ"،"سہ وایہ" اور "پند نامہ سعدی" نامی تینوں کتابیں میرے ساتھ تھیں،جن کے متعلق فرصت کے اوقات میں عبدالرحیم صاحب سے پوچھتا رہتا تھا جو خوشی خوشی سمجھاتے اور میری حوصلہ افزائی بھی کرتے۔

دسمبر 1897 میں ضلع کے ڈپٹی ایجوکیشن انسپکٹر مرحوم مرزا صادق علی بیگ ٹنڈو آدم آئے تو انہیں میں نے اپنے وطن تبادلہ کرنے کی درخواست کی۔مرحوم آخوند عبدالرحیم صاحب،ہیڈ ماسٹر نے بھی پرزور سفارش کی،جس پر مرزا صاحب مرحوم نے میرا تبادلہ گوٹھ سنجاپور تحصیل ٹنڈو باگو کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے طور پر کر دیا۔

سنجاپور ٹنڈو باگو سے نو میل کے فاصلے پر تھا،جہاں کے زمیندار رئیس ٹھارو خان جمالی بلوچ جن کی

کوششوں سے یہ اسکول قائم ہوا تھا، کے بیٹے، بھتیجے اور دیگر عزیز و اقارب اُسی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔

اس لیے کھانا پینا مفت میں ملتا تھا اور جب میں اپنے گاؤں آتا تو سواری کے لئے وہ جانور بھی مہیا کرتے۔ رئیس ٹھارو خان کا آبائی گاؤں سنجا پور سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ شام کو اسکول بند کر کے اس گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ جاتا اور صبح ناشتہ کر کے آ کر اسکول کھولتا تھا۔ دوپہر کا کھانا لڑکوں کے کھانے کے ساتھ آتا تھا۔ شام، رات اور صبح کی نمازیں رئیس ٹھارو خان کے گاؤں کی مسجد میں پیش امام کے طور پر پڑھاتا تھا، بڑے طلبہ کو نماز سکھاتا اور اپنے ساتھ انہیں بھی نماز پڑھاتا، ان باتوں کی وجہ سے رئیس ٹھارو خان اور گاؤں کے دیگر لوگ مجھ سے انتہائی خوش تھے۔

میں جو عرصہ سنجا پور میں رہا اس دوران مولوی محمد سلیمان نظامانی، جو کہ تلھار کے قریب رہتے تھے تین چار مرتبہ سنجا پور آئے کیونکہ سنجا پور کی رنگریز برادری، قریب ہی رہنے والے تالپوروں اور دیگر لوگوں کے ساتھ انکی قریبی راہ و رسم تھی۔ اس دوران وہ تین چار گھنٹے میرے اسکول میں گزارتے اور فارسی ابیات جو انہیں یاد ہوتے، پڑھ کر انکے معنی اور تشریح بیان کرتے۔ وہ کچھ ابیات مجھے سمجھاتے اور کچھ مجھ سے تحریر کراتے، اسکے علاوہ وہ شریعت کے کئی اصول اور عقائد بھی سمجھاتے۔

مولوی محمد سلیمان کی صحبت و گپ شپ سے مجھے ایک تو فارسی پڑھنے کا زیادہ شوق پیدا ہوا، تو دوسری جانب قرآن شریف کے معنی اور شرعی اصولوں سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کی جستجو بھی پیدا ہوئی، تو تیسری جانب اپنی شاعری کرنے کا بھی اشتیاق پیدا ہوا، کیونکہ مولوی صاحب دوران گفتگو اپنی فارسی اور سندھی شاعری کا جابجا استعمال کرتے۔ انہی جذبات اور احساسات کے تحت مجھے ٹریننگ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی چاہ پیدا ہوئی۔

ان دنوں کمیٹی امتحان پاس کرنے والے اساتذہ کا دوسرا امتحان ٹریننگ کالج میں ہوتا تھا، جس کو داخلے کا امتحان کہا جاتا تھا۔ کامیاب امیدوار کو ٹریننگ کالج کے سال اول میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ملتی تھی۔ میں سنجا پور میں ملازمت کے دوران داخلہ امتحان کی تیاری بھی کرتا رہا، بالآخر دسمبر 1897 میں داخلے کے امتحان میں کامیاب ہوا، اور ٹریننگ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا

حکم نامہ وصول کیا، جس پر ملازمت سے مستعفی ہو کر میں جنوری 1899 کی ابتداء میں ٹریننگ کالج کے سال اول میں آ کر داخل ہوا۔

تیسری منزل۔ ٹریننگ کالج میں تعلیم:

الف۔ فارسی کی تعلیم:

ٹریننگ کالج کے سال اول پر فارسی کی تین کتابیں تھیں، (1) آغاز فارسی (2) پند نامہ فارسی (3) فارسی آموز (گرامر)۔

آغاز فارسی اور پند نامہ فارسی تو میرے پہلے سے اچھی طرح سمجھے اور حل شدہ تھے، ان کے علاوہ دووایہ، سہ وایہ اور آمد نامہ بھی اچھی طرح سمجھ چکا تھا، اس لئے فارسی رموز حل کرنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس وقت کے فارسی کے استاد مرحوم قاضی امید علی صاحب گل انداز حیدر آبادی نے کرم مہربانی کی کہ مجھے "گلستان" اور "بوستان" پڑھنے کا مشورہ دیا۔ یہ دونوں کتابیں ٹریننگ کالج کے سال دوئم میں پڑھائی جاتی تھیں۔ دونوں کتابیں اپنے طور پر پڑھتے ہوئے، کسی مشکل پیش آنے کی صورت میں مرحوم قاضی صاحب سے فرصت کے اوقات یا تعطیلات کے ایام میں انکے مہمان خانے جا کر سمجھتا رہتا تھا۔ بعد ازاں مرحوم قاضی صاحب کی ہدایات کے تحت لغت کی دو کتابیں (ایک کریم اللغات اور دوسری غیاث اللغات) کالج کی لائبریری سے حاصل کر کے میں نے اپنے پاس رکھیں اور لائبریری سے مختلف فارسی کتب (نثر اور نظم کے) وقفے وقفے سے لاتا اور ان لغات کی مدد سے مشکل فارسی کتاب بھی کسی دقت کے بغیر آسانی سے پڑھ لیتا تھا۔

ب۔ عربی کی تعلیم:

سال دوئم کی پہلی ٹرم میں مرحوم قاضی اُمید علی صاحب استاد فارسی نے مجھے عربی پڑھنے کا مشورہ دیا۔ اتوار کے دن وہ مجھے اپنے پڑوسی مرحوم سید محمد فاضل شاہ صاحب کے پاس لے گئے جو ستر برس کے ایک بزرگ تھے اور انکی جامع مسجد میں قرآن شریف کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ مرحوم سید فاضل شاہ یکتا عالم اور مفتی تھے اور پورا دن مسجد میں تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے اور

قاضی صاحب کی سفارش پر مجھے عربی کی تعلیم دینے پر رضامند ہو گئے، ملاقات کے دوران عربی نحو اور صرف کی دو تین کتابیں تجویز کیں جو کہ لاہور سے حاصل کرنے کیلئے کتب فروش کا پتہ بھی عنایت فرمایا۔ ابتدائی طور پر انہوں نے تین کتابوں "صرف میر"، "نحومیر" اور "ماءۃ عامل" سے ابتدا کی۔ ہر اتوار کو یا دیگر تعطیلات پر میں جب بھی انکے پاس جاتا تو ان کتابوں میں سے صرف اور نحو کے قواعد برزبان سمجھاتے، میں اپنے طور پر جو اسباق سمجھ کر اور یاد کر کے آتا انکا برزبان استعمال دریافت کرتے۔

صرف اور نحو کے قواعد حل کرنے کے بعد، "تفسیر حسینی" اور "مشکواۃ شریف" شروع کی، بعدازاں "شرح ملا" اور "منطق الطیر" عربی شروع کرائی، مطلب یہ کہ میں پورا سال اپنی رسمی تعلیم کے ساتھ عربی پر بھی محنت کرتا رہا یہاں تک کہ کسی بھی عربی عبارت کے معنی سمجھنے میں مجھے کوئی وقت نہیں ہوتی تھی، اگر کبھی ضرورت محسوس ہوتی تو "نفائس اللغات" اور "غیاث اللغات" سے کسی عربی لفظ کی بنیاد نکالتا تھا۔

ث۔ شعرسازی کی تعلیم:

مرحوم سید محمد فاضل شاہ جتنے بڑے عالم تھے، اُتنے ہی عمدہ شاعر۔ میں ٹنڈو آدم میں رہتے ہوئے ہی اپنے دل کی تسکین کے لئے کچے پکے اشعار لکھنے لگا تھا، لیکن شعر سازی کے قواعد و اصولوں سے بالکل کورا تھا۔ ایک مرتبہ میں سید محمد فاضل شاہ سے عربی کا سبق لے رہا تھا کہ حیدرآباد کے نامور شاعر مرحوم سید محمد فاضل شاہ (گدا) کراچی سے شائع ہونے والا اخبار "معین الاسلام" لیکر آئے جس میں شمالی سندھ کے کسی شاعر کی غزل شائع ہوئی تھی۔ اس غزل کے سقم پر دونوں صاحبان میں بہت بحث ہوئی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا، اگلی مرتبہ میں اپنی ایک کچی پکی غزل سید محمد فاضل شاہ صاحب کے پاس لے گیا، مرحوم نے میری غزل دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا کہ؛ "خاطر جمع رکھو، تمھیں شعر کے قواعد اچھی طرح سمجھا دونگا"۔ انہوں نے مجھے "چہار گلزار" اور "حدائق البلاغت" نامی دو کتابیں خرید کرنے کے لئے کہا جو آئندہ اتوار کو ان کے پاس لے گیا۔ انہوں نے

پہلے "چہار گلزار" سے عروض والا حصہ پڑھنے اور عروض کے قواعد سمجھنے کا حکم کیا چونکہ کتابی فارسی پڑھنے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی، اس لئے علم کے بحر، اراکین اور تقطیع میں کہیں کہیں سائیں مرحوم سے رہنمائی لینے کی ضرورت محسوس ہوتی جبکہ، "علم بدائع" کا حصہ جس میں لغوی اور معنوی رہنمائی دی گئی تھی، کو سمجھنے کیلئے سائیں مرحوم سے رہنمائی لیتا تھا، جو کہ وہ مجھے اپنی سندھی شاعری سے مثالیں دیکر سمجھاتے تھے، چنانچہ دو تین ماہ کے اندر مندرجہ بالا دونوں کتابوں کو اچھی طرح سمجھ گیا، بعدازاں جب کوئی نظم تیار کر کے سائیں مرحوم کو دکھاتا تھا تو وہ انتہائی خوش ہوتے اور جہاں کہیں درستگی کی ضرورت ہوتی وہاں درستگی تجویز کرتے۔

افسوس کہ سائیں سید محمد فاضل شاہ مرحوم نومبر 1900 میں انتقال کر گئے جب میں سال دوئم کا امتحان دے رہا تھا۔ سائیں مرحوم کے انتقال کے بعد اگر کسی عربی کتاب کی کسی عبارت کو سمجھنے میں وقت ہوتی تو دو بزرگ عالموں میں سے کسی ایک کے پاس جا کر اسکو حل کراتا تھا۔ حیدرآباد کے یہ نامور عالم مرحوم مولوی حاجی عبداللطیف صاحب جن کا عربی تعلیم کا ایک بہت بڑا مدرسہ تین نمبر تالاب کے علاقے میں واقع تھا اور دوسرے مرحوم مولوی سید حاجی محمد علی شاہ صاحب جو مغربی کچا کے علاقے میں لاکھا برادری کی جامع مسجد کے پیش امام تھے اور ہر جمعہ کو اس مسجد میں وعظ دیتے تھے۔ اگر کسی نظم پر علم عروض کو اصولوں یا وضاحت یا بلاغت کے کسی مسئلے پر کوئی بحث کرنی ہوتی تو مرحوم آخوند فقیر محمد صاحب (عاجز) کے پاس جا کر مشکل حل کراتا جو کہ حیدرآباد کے شیرانی ملاں محلے میں رہنے والے ایک بزرگ شاعر تھے۔

ج۔ کتابوں کے مطالعے کا شوق:

جنوری 1901 میں ٹریننگ کالج کے سال دوئم کی جماعت میں داخل ہونے کے بعد مجھے اپنے تدریسی کاموں کے ساتھ کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ ٹریننگ کالج میں طلبہ کیلئے مختص لائبریری میں سندھی، اردو اور فارسی نثر و نظم کی کافی تعداد میں کتابیں موجود تھیں۔ میں ہر مرتبہ ایک یا دو کتابیں جاری کراتا جو کہ پڑھ کر واپس کرنے کے بعد مزید کتابیں لے آتا تھا۔ مجھے یقین ہے

کہ اس لائبریری کی کوئی بھی کتاب میرے مطالعے سے بچ نہیں سکی ہوگی۔

میری عادت تھی کہ کسی بھی کتاب میں اگر کوئی نیا لفظ ملتا تو اسکی معنی تلاش کرتا۔ فارسی اور عربی زبانوں کے الفاظ کے معنی معلوم کرنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوتی کیونکہ انکی لغات میرے پاس موجود تھیں، تاہم کچھ ہندو صاحبان کی تصنیف کی گئی کتابوں میں سنسکرت زبان کے الفاظ استعمال کئے گئے ہوئے تھے، جنکے معنی دریافت کرنے میں وقت پیش آتی تھی، اس لئے ایسے سنسکرت کے الفاظ اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتا تھا، جب ان الفاظ کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا تو میں اپنی نوٹ بک اپنے استاد مسٹر ادھن مل سترام داس سدھانی (ٹھٹوی) کے پاس لے گیا، جو سینئر اور سندھی کے ایک قابل استاد تھے، انہوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے، ٹریننگ کالج کے اساتذہ کی لائبریری سے "وڈیچتی کوش" نامی شائع شدہ سندھی کتاب منگوائی جس میں الف، ب کی ترتیب سے سندھی اور سنسکرت کے الفاظ اور معنی درج تھے۔ یہ کتاب ایک طویل عرصے کیلئے استاد محترم نے میرے حوالے کردی پھر مجھے سنسکرت زبان کے کسی لفظ کو سمجھنے میں کوئی وقت پیش نہیں آئی۔

د۔ پرنسپل صاحب کی کرم نوازش:

میرے ٹریننگ کالج کے سال اول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران کالج کے پرنسپل سرگواسی رائے بہادر دیوان کوڑومل ادھن مل کھنانی (بھریائی) تھے۔ وہ 1899 کے اواخر میں پنشن پر گئے تو رائے بہادر دیوان تاراچند شوقی رام آڈوانی (حیدرآبادی عامل) جو کہ وائس پرنسپل اول تھے، پرنسپل ہوگئے۔ دیوان تاراچند صوفی مسلک کے ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ وہ برھمو سماج کے غیر تعصب شخص اور نور محمد ہائی اسکول کی مغربی سمت میں واقع برھمو مندر کے رہنما تھے۔ انہوں نے برھمو سماج کی جانب سے ایک ماہنامہ جاری کیا، جس میں تصوف کے افکار پر مبنی مضامین شائع ہوتے تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ "مسافر" شاعری کرتا ہے تو برھمو سماجی رسالے کیلئے نثر میں تحریر کردہ فقرے مجھ سے نظم میں لکھواتے جو کہ انتہائی پسند کئے جاتے۔ انہوں نے رسالے کے

پروف دیکھنے کی ذمہ داری بھی مجھے سونپ دی تھی۔

نومبر 1901 میں میرا سال سوئم کا امتحان مکمل ہوگیا تو دیوان صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ، "میری خواہش ہے کہ تم میرے زیر دست ملازمت کرو، مجھے تمھاری ترقی اور بہتری کی فکر ہے، تمھارا کیا خیال ہے"؟

اگرچہ مجھے دل و جان سے اپنے وطن واپس جا کر ملازمت کرنے کی امید اور ارادہ تھا لیکن دیوان صاحب کی نوازش اور خیر خواہی بھرے الفاظ سن کر مجبور ہوگیا اور انکے زیر دست ملازمت کرنے پر راضی ہوگیا۔

چوتھی منزل۔ ٹریننگ کالج میں ملازمت کی ابتداء:

الف۔ پریکٹسنگ اسکول میں ملازمت:

سال سوئم کا امتحان پاس کر کے، میں تعطیلات پر اپنے گاؤں آیا۔ دسمبر 1901 کے اواخر میں ایجوکیشنل انسپکٹر سندھ کا حکم نامہ پہنچا کہ، "تمھیں ٹریننگ کالج حیدرآباد کے پریکٹسنگ اسکول میں نائب استاد مقرر کیا جاتا ہے"۔ حکم نامہ ملنے کے بعد میں 1902 کی ابتداء میں ملازمت پر آ کر حاضر ہوا، اس وقت پریکٹسنگ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ٹھارو مل حیدرآبادی تھے۔

میرے ملازمت پر آتے ہی دیوان تاراچند نے مجھ پر یہ مہربانی کی کہ مجھے شہر کے رہائشی کرائے سے بچانے کی خاطر کالج کے ہاسٹل میں ایک کشادہ کمرا، چارپائی، میز اور کرسی سمیت دلوائی جبکہ میرے کھانے پینے کا بندوبست مسلمانوں کے بورڈنگ ہاؤس میں کروایا جس کی حصہ داری مجھ سے کبھی بھی نہیں مانگی گئی۔

پریکٹسنگ اسکول میں مقررہ اوقات کے دوران کام کرنے کے بعد دیوان صاحب کی جانب سے مجھ پر یہ کام رکھا گیا تھا کہ انکے پاس جب بھی محکمہ تعلیم کی کوئی کتاب نظر ثانی یا منظوری کیلئے آتی تو وہ میرے حوالے کرتے اور میں وہ کتاب توجہ سے دیکھ کر، عبارت کی گرامر کو یا اشاعت کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے، ایک علیحدہ کاغذ پر درج کر کے دیوان صاحب کے حوالے

کرتا۔ بعدازاں وہ اس کتاب پر اپنی رپورٹ تحریر کر کے حکام بالا کو ارسال کرتے۔ دیوان صاحب کے برھمو سماج کے رسالے کے پروف دیکھنے اور اس رسالے کیلئے دیوان صاحب کی فرمائش پر نثر یا نظم تیار کرنا بھی میری ذمہ داری تھی۔

ٹریننگ کالج سے اگر کوئی استاد چھٹیوں پر جاتا تو اس کی جگہ مجھے قائم مقام رکھا جاتا تھا، جہاں میں تینوں سال کی جماعتوں کے طلبہ کو فارسی اور سندھی پڑھانے کا ذمہ دار میں ہوتا تھا۔ پریکٹسنگ اسکول میں مجھے سالانہ ترقیاں بھی تیز رفتاری سے خاصی بڑی تعداد میں حاصل ہوئیں۔

سال 1903-04 کے دوران محکمہ تعلیم کی جانب سے جو "اخبار تعلیم" پرنسپل صاحب کے زیر اہتمام جاری ہوا، اس کے ادارتی فرائض بھی دیوان تاراچند صاحب نے میرے حوالے کئے اور ماہانہ سرکاری ادارتی الاؤنس بھی مجھے دلوایا۔ اس وقت سے جو نثری مضامین اور شاعری میرے نام سے یا ادارتی مواد کے طور پر اخبار تعلیم میں شائع ہوئے انکی گواہی آج بھی اخبار تعلیم کا پرانا ریکارڈ دے سکتا ہے جو سندھ کے لگ بھگ ہر اسکول میں تاحال محفوظ ہے۔

1905-06 میں حکومت بمبئی نے بمبئی ریزیڈنسی کی مختلف زبانوں کی درسی کتب ایک جیسی ٹائپ پر نئے سرے سے تیار کرنے کیلئے ٹیکسٹ بک کمیٹی پونا میں قائم کی، جس کیلئے سندھ کی جانب سے رائے بہادر دیوان پریم چند آوترائے جھانگیانی کو مقرر کیا گیا، جو اس وقت حیدرآباد ضلع کے ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر تھے۔ دیوان پریم چند سندھی درسی کتب کا تمام تر مواد سندھ میں رہائش پذیر اپنے دو دوستوں رائے بہادر دیوان بولچند دیارام پرنسپل نولرائے ہیرانند اکیڈمی حیدرآباد اور رائے بہادر دیوان تاراچند شوقی رام آڈوانی پرنسپل ٹریننگ کالج حیدرآباد کی مشاورت سے سندھ سے تیار کرا کے اپنے پاس پونا منگواتے تھے۔ رائے بہادر دیوان بولچند صاحب اور رائے بہادر دیوان تاراچند صاحب نے اس وقت سندھی پہلی، دوسری اور تیسری جماعت کی کتب کے تمام نثری اور نظم کے اسباق مسکین مسافر (محمد صدیق مسافر) سے تیار کرا کے دیوان پریم چند صاحب کو پونا ارسال کئے تھے۔ یہ شاعری آج تک ان کتابوں میں شامل ہے جبکہ میں نے اپنی "کلیات" میں بھی شامل کر دی ہے۔ جب پونا کی ٹیکسٹ بک کمیٹی نے اپنا کام مکمل کر لیا تو دیوان پریم چند صاحب کی

سفارشی رپورٹ کے مطابق پبلک انسٹرکشن بمبئی کے ڈائریکٹر صاحب نے مجھے پچانوے روپے انعام اور ایک آفرین نامہ پرنسپل صاحب کے ذریعے بھیجا۔

ب: انگریزی تعلیم:

پریکٹسنگ اسکول میں ملازمت شروع کرنے کے چار پانچ ماہ بعد پرنسپل دیوان تاراچند صاحب نے مجھے انگریزی پڑھنے کا مشورہ دیا جو میں نے شکر گزاری کے ساتھ قبول کیا۔ دیوان صاحب کے دو سالے انگریزی چھٹی جماعت کے طالب علم تھے اور روزانہ رات کو میرے کمرے میں آ کر مجھ سے فارسی کا سبق لیتے اور مجھے انگریزی کا سبق دیتے تھے۔ اتوار یا چھٹی کے دیگر دنوں میں ہم دن میں دو ڈھائی گھنٹے پڑھائی کرتے۔ آٹھ دس ماہ کے اندر میں تین ریڈر اچھی طرح معنی اور مشق کے ساتھ پڑھ اور سمجھ گیا، تاہم وہ دونوں مجھے انگریزی گرامر ٹھیک طریقے سے سکھا نہیں سکے۔ چونکہ مجھے خدا تعالیٰ کے فضل سے سندھی، عربی اور فارسی گرامر کی مناسب معلومات تھی، اسی تناظر میں ان سے انگریزی گرامر کا معلوم کرتا جس کا ان سے تشفی بھرا جواب حاصل نہیں کر پاتا۔ اس صورتحال سے متعلق دیوان صاحب کو گذارش کی جنہوں نے ہاؤس استاد ہونے کی وجہ سے اپنے خاندان سمیت ہاسٹل میں ہی رہنے والے ایک نہایت نیک طبیعت، قابل اور ٹریننگ کالج کے ایک گریجویٹ نائب استاد مسٹر لیلارام پریم چند وادھوانی کو میری انگریزی تعلیم کیلئے سفارش کی جو انہوں نے انتہائی فراخدلی سے قبول کر لی۔ میں رات کو روزانہ تقریباً ایک گھنٹے کیلئے لیلارام صاحب کے پاس جاتا جنہوں نے مجھے نہ صرف انگریزی ریڈرس اور گرامر اچھے طریقے سے سمجھائے بلکہ ریاضی، سائنس، تاریخ وجغرافیہ جن کے متعلق سندھی میں مجھے کافی معلومات تھی، سے متعلق انگریزی اصلاحات اور اصول بھی اچھی طرح سے ذہن نشین کرائے۔

مسلسل تین سال تک لیلارام صاحب کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے دیوان تاراچند صاحب کو یقین دہانی کرائی کہ اب مسافر میٹرک کا امتحان دے سکتا ہے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو 1908 میں جو طلبہ میٹرک کے امتحانات کیلئے بھیجنے تھے، انکے

ابتدائی امتحان میں مجھے بھی دیوان تاراچند کی سفارش پر بٹھایا گیا۔اس امتحان میں مجھے اچھے نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل ہوئی۔ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر خوبچند لعلوانی صاحب نے پیپر جانچنے کے بعد دیوان تاراچند کو یقین دلایا کہ "مسافر کو میٹرک کے امتحان میں بٹھانے کا بندوبست کیا جائے، امید ہے کہ وہ اس امتحان میں کامیاب ہوجائے گا۔"

ث۔امتحان میں قدرتی رکاوٹ اور دیوان صاحب کی مہربانی:

میٹرک کے امتحان کیلئے درخواست دینے اور فیس جمع کرانے میں تھوڑا وقت ہی بچا تھا کہ جولائی 1908 کے اواخر میں، میں ہیضے کی بیماری کا شکار ہوگیا، جو اس وقت حیدرآباد میں وباء کی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔اُن دنوں میں ٹنڈو ولی محمد میں ایک کرائے کے گھر میں رہتا تھا جو کہ میں نے 1905 میں اپنی شادی کے بعد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کیلئے حاصل کیا تھا۔کچھ ماہ قبل ہی میری بیوی کا انتقال ہوا تھا، اس وجہ سے میں 1908 میں ہیضے کا شکار بننے کے وقت اس گھر میں اکیلا ہی تھا۔

ہیضے کی حالت میں عیادت کیلئے آنے والے دوست احباب کے مشورے پر میں نے تھادل پینے اور نہانے پر زور دیا، جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ قے اور دست تو ختم ہوگئے لیکن دماغ کے پردے ایسے خراب ہوئے کہ میں بالکل ہی پاگل ہوگیا۔نہ کھانے پینے کا ہوش اور نہ ہی نیند و آرام کا، صرف بکواس میں ہی پورا دن اور رات گزار لیتا تھا۔اس دماغی حالت کا جب دیوان رائے چند صاحب کو علم ہوا تو دو اردلی گھوڑا گاڑی پر اپنے ساتھ لائے اور مجھے گاڑی پر سوار کر کے ٹریننگ کالج لے آئے، جہاں ایک کشادہ کمرے میں مجھے رکھ کر دروازے پر اردلیوں کو کھڑا کر کے خود سول اسپتال سے یورپی سول سرجن کو لے کر آئے۔جس نے میرا اچھے طریقے سے معائنہ کر کے علاج شروع کیا۔سول سرجن نے دیوان صاحب کو خصوصی طور پر تاکید کی کہ، "اسے کوئی کتاب یا اخبار پڑھنے نہ دیا جائے اور نہ ہی وہ زیادہ بات چیت کرے۔"

باہر نکلنا مکمل طور پر بند ہوگیا جبکہ حاجت روائی کیلئے ایک کموڈ کرسی کمرے کے اندر ہی پڑی

ہوتی، جسکی ایک بھنگی صبح و شام صفائی کرتا۔ڈاکٹر نے کھانے پینے کے متعلق بھی خاص ہدایات جاری کیں۔

دیوان صاحب نے تیسری جماعت کے ایک طالب علم اور ایک اردلی کو میری نظرداری کیلئے مقرر کیا، جو کہ کمرے کے باہر چارپائی ڈال کر بیٹھتے تھے۔وہ لوگ سول سرجن کی تجویز کردہ دوا مقررہ وقت پر دیتے اور سر میں مالش وغیرہ بھی کرتے۔

دیوان صاحب کالج کی بالائی منزل پر اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے، اسی جگہ آج تک پرنسپل صاحبان کی رہائش ہے۔دیوان صاحب اپنے باورچی خانے میں تیار ہونے والا کھانا میرے لئے صبح، دوپہر اور شام بھیجتے تھے، صبح و شام، کبھی کبھار تو رات کو بھی میری مزاج پرسی کیلئے آتے۔ابتدائی دنوں میں تو دیوان صاحب سول سرجن کو ایک دن وقفے کے بعد میرے معائنے کیلئے لاتے تھے، بعد ازاں یہ معائنہ ایک ہفتے کے وقفے کے بعد ہونے لگا۔سول سرجن مسلسل تین ماہ تک میرا علاج معالجہ کرتے رہے جبکہ اس دوران کھانا پینا دیوان صاحب کے باورچی خانے سے ہی ہوتا رہا۔اسی دوران میں نے خود کو صحت مند محسوس کرنا شروع کیا اور سول سرجن نے بھی گھومنے پھرنے اور لکھنے پڑھنے کی اجازت دے دی۔تین ماہ کے بعد مکمل طور پر اپنے کام پر واپس آیا تاہم دیوان صاحب مجھے زیادہ لکھنے پڑھنے سے روکتے رہے۔

یہی سبب تھا کہ میں میٹرک کا امتحان نہیں دے سکا اور پھر دوبارہ کبھی اس امتحان دینے کی کوشش بھی نہیں کی، صرف انگریزی کتابوں کا مطالعہ اور ترجمہ کرتا رہا۔اب مجھے کسی بھی انگریزی کتاب کے ترجمے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

پانچویں منزل۔کالج میں ملازمت:

میں نے مسلسل دس برس پریکٹسنگ اسکول میں ملازمت کی، اس دوران کئی مرتبہ کالج میں قائم مقام طور پر فارسی اور سندھی کا استاد بھی رہا اور دو تین مرتبہ پریکٹسنگ اسکول کا قائم مقام ہیڈ ماسٹر بھی بنا، بالآخر 1912 میں کالج کے فارسی کے استاد قاضی جمال الدین صاحب

شکارپوری بیماری کی بناء پر چھٹیوں پر گئے اور وہیں سے پنشن کی درخواست دائر کر دی ۔ پرنسپل صاحب مجھے پہلے ہی سندھی اور فارسی کا قائم مقام استاد رکھ چکے تھے، اب قاضی صاحب کی پنشن کی درخواست کے بعد دیوان صاحب نے مجھے کالج میں مستقل استاد کے طور پر مقرر کرنے کی زوردار سفارش کی ۔ بمبئی سے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کی جانب سے اس درخواست کی منظوری تک دیوان تاراچند کے پنشن پر جانے کا وقت آ گیا اور انکی جگہ دیوان پریم چند آوترائے جھانگیانی صاحب ٹریننگ کالج کے پرنسپل مقرر ہو گئے اور 1913 کی ابتداء میں پرنسپل کے فرائض منصبی سنبھال لئے ۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد میری کالج میں فارسی اور سندھی کے مستقل طور پر استاد ہونے کی تقرری ہو گئی۔

دیوان پریم چند صاحب سے میرا اپوتا کی ٹیکسٹ بک کمیٹی کے دنوں میں تعارف ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے پرنسپل کی حیثیت سے آنے کے بعد انہوں نے مجھ پر اپنی مہربانی کی نظر برقرار رکھی ۔ محکمہ تعلیم کے درسی اور نظامی خواہ لائبریری کتب کے جائزے کا جو کام رائے بہادر دیوان چند صاحب مجھ سے لیتے تھے اور اخبار تعلیم کی ادارت کے فرائض جس طرح دیوان تاراچند صاحب کے دنوں میں میرے سپرد تھے، اسی طرح مسلسل چھ سال دیوان پریم چند کی زیرنگرانی بھی خوشی و خوبی کے ساتھ گزرے۔

الف۔ اچانک شرانگیزی:

1919 میں جب ہندوستان میں قطع تعلقات یعنی ترک موالات کی تحریک نے زور پکڑا اور ہندو مسلم اتحاد قائم ہو گیا اور برطانوی حکومت جب مشکلات کا شکار ہو گئی تو اس دوران مختلف شہروں میں قومی رہنماؤں کی پرجوش تقریروں کے زیراثر کئی اہم افراد نے سرکاری اعزازات واپس کر دیئے اور کئی ایک نے سرکاری عہدے اور سرکاری ملازمتیں چھوڑ دیں ۔ ان دنوں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مہاتما گاندھی سمیت قومی اور سندھ کی سطح کے رہنماؤں کی حیدرآباد میں کی ہوئی تقریروں پر میں ایک دن اساتذہ کے کمرے میں ایک نومسلم استاد کے ساتھ بیٹھ کر بات کر رہا تھا جو کہ کافی عرصے سے حسد کرنے والے ایک حیدرآبادی عامل استاد نے بھی سن لیں۔

، بعدازاں اس نے ہماری گفتگو میں مرچ مصالحہ ڈال کر پرنسپل صاحب کے ایسے کان بھرے کہ انہیں یقین ہو گیا کہ ہم دونوں مسلمان اساتذہ کالج کے طلبہ میں قطع تعلقات کا جوش پیدا کر کے کالج میں کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیں گے۔

پرنسپل صاحب نے ہم سے کوئی معلومات حاصل کئے بغیر ہم دونوں کے خلاف سخت الفاظ میں ایک خفیہ رپورٹ ایجوکیشن انسپکٹر کو ارسال کر دی ۔ میرے ساتھی استاد شیخ صاحب کے کوئی کرم فرما کراچی میں رہتے تھے اور ایجوکیشن انسپکٹر کے دفتر میں مراسم رکھتے تھے، نے شیخ صاحب کو بذریعہ خط اسکی اطلاع دی اور مشورہ دیا کہ اس رپورٹ کے نتیجے میں جاری ہونے والے کسی حکم کے اجراء سے قبل ہی ہم دونوں چھٹیوں پر چلے جائیں جس دوران اس کارروائی کا کوئی سدباب کیا جائے۔

شیخ صاحب نے فوری طور پر یہ خط مجھے دکھایا تو میں نے فوراً عمومی چھٹی کی ایک درخواست دائر کی جو پرنسپل صاحب نے خاموشی کے ساتھ منظور کر لی ۔ میں نے ان دنوں دوسری شادی کی تھی اور اپنے بال بچوں کے ساتھ حیدرآباد میں رہائش پذیر تھا ۔ اپنے بال بچے لیکر میں اپنے گاؤں چلا گیا اور وہاں مرحوم خان بہادر میر غلام محمد خان تالپور اوبلی کے جاگیردار سے ملاقات کیلئے چلا گیا جس طرح ہمیشہ گاؤں آنے کے موقعہ پر کرتا تھا ۔ میر صاحب کو اس شرانگیزی کا بتایا جو کالج میں میرے خلاف کھڑی کی گئی تھی، میر صاحب بختاور (خداوند کریم جل شانہ انکی نیک روح کو فردوس اعلیٰ میں جگہ بخشے) نے مسکراتے ہوئے فرمایا، "ماسٹر صاحب! میں تو راستہ تلاش کر رہا تھا کہ تم ملازمت سے جلد فارغ ہو کر گاؤں واپس آ جاؤ ۔ ملازمت کی کوئی فکر نہ کرو، اس مسئلے کو انشاء اللہ حل کر لیں گے لیکن فوری طور پر فرلو چھٹی کی ایک درخواست ارسال کرو تا کہ اپنے گاؤں میں انگریزی اسکول کھولا جائے، اسی دوران حیدرآباد جا کر اپنے گھر کا سازوسامان لے آؤ"

میں نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد جواب دیا "میر صاحب! جو آپ کی مرضی ہو گی ویسا ہی کروں گا" میر صاحب نے بنگلے سے قلم اور کاغذ منگوائے اور فرمانے لگے، "فرلو چھٹی کی درخواست لکھو" درخواست کی میں نے دو نقول تیار کیے، ایک پرنسپل صاحب کی معرفت ایجوکیشن انسپکٹر

صاحب کے نام اور دوسری براہ راست ایجوکیشن انسپکٹر کے نام۔ درخواست میں جو نام نہاد ذاتی ضروریات درج کیں، وہ جب میر صاحب کو پڑھ کر سنائیں تو وہ انتہائی محظوظ ہوئے۔ لفافے میر صاحب کے پاس میز کی دراز میں موجود تھے، ان پر پتے درج کرکے میر صاحب نے اپنے ملازم کو رجسٹرڈ پوسٹ کرانے کیلئے بھیج دیا، جس نے دولفافے ارسال کرکے رسیدیں لاکر دیں۔ میر صاحب نے اس وقت مجھے پچاس روپے دیکر کرکہا کہ حیدرآباد جاکر اپنے گھر کا سامان لے آؤں۔

دوتین دن گاؤں میں رک کر میں حیدرآباد آیا، وہاں کچھ کرم فرماؤں کے ذریعے معلوم ہوا کہ فرلو چھٹی کی درخواست پرنسپل صاحب نے اپنی سفارش کے ساتھ بالا افسران کو ارسال کردی ہے۔ درخواست ارسال ہونے کے اگلے روز خفیہ رپورٹ کا فیصلہ بھی پرنسپل صاحب کے دفتر میں آگیا تھا، جس میں کہا گیا ہے کہ، "مسافر کا ٹریننگ کالج سے تبادلہ کرکے انکو لوکل بورڈ سندھی اسکول گوٹھ بوھارا تحصیل میرپورساکرو ضلع کراچی میں ہیڈ ماسٹر مقرر کیا جاتا ہے۔"
پرنسپل صاحب نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ اپنے کلرک کو حکم دیا کہ مسافر کے تبادلے سے متعلق ایجوکیشن انسپکٹر کا حکم نامہ، مسافر کے فرلو چھٹیوں سے واپس آنے تک رکھ دیا جائے اور یہ اُسے دستی طور پر دیا جائے۔
یہ مکمل حقیقت کالج میں کام کرنے والے اپنے کچھ خیر خواہوں سے جان کر، اپنے گھر کا ساز و سامان کشتی پر چڑھا کر میں گاؤں واپس آگیا۔

ب۔ وطن میں انگریزی اسکول کا قیام:

فارسی میں درست کہا گیا ہے،

"خدا شری برانگیزد کہ خیر ما در آں باشد"

(خداتعالی اپنی حکمت سے ایسی کوئی ناخوشگوار صورتحال بھی پیدا کرتا ہے جو ہمیں اپنے خلاف نظر آتی ہے لیکن درحقیقت اس صورتحال میں بھی ہمارے لئے کوئی بہتری سمائی ہوئی ہوتی ہے)

اس مقولے کے مطابق ٹریننگ کالج میں نیک نیتی سے ملازمت کرتے ہوئے مندرجہ بالا شرانگیزی، جوکہ میرے حق میں پیدا ہوئی، سے مجھے سب سے زیادہ یہ بہتری حاصل ہوئی کہ مجھے اپنے وطن کی خدمت کرنے کا موقعہ مل گیا اور گذر بسر بھی آسانی کے ساتھ ہونے لگا۔
میرے حیدرآباد سے اپنے گھر کا سامان لانے تک مرحوم خان بہادر صاحب نے میرے محلے میں اسکول کیلئے ایک جگہ کرائے پر حاصل کی اور لکڑی کے چار پانچ بنچ بھی بڑھئی سے بنوالئے جبکہ میزیں اور کرسیاں تو پہلے سے ہی میر صاحب کے بنگلے پر موجود تھیں۔
حیدرآباد سے واپسی پر میر صاحب نے کرائے پر حاصل کی گئی جگہ، ایک میز اور دو کرسیاں میرے حوالے کیں۔ اسکول میں پینے کے پانی کیلئے مٹکے، لوٹے، کاغذ وغیرہ کی خریداری کیلئے نقد رقم میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ اب طلبہ کو داخل کرو اور بسم اللہ کرکے اسکول شروع کرو۔ شہر کے لوگوں کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ٹنڈو باگو میں کوئی انگریزی اسکول چل سکتا ہے، اس لئے ایک اونٹ کرائے پر حاصل کرکے میں ٹنڈو باگو سے دس میل کے فاصلے پر ایک گاؤں گیا، جہاں پر ایک بہت بڑا رجسٹرڈ مکتب واقع تھا جو کہ ایک چھوٹے زمیندار میاں محمد حسن خان لغاری اپنے سینئر طلبہ کی مدد سے چلاتے تھے جسے حکومت کی طرف سے بھی امداد ملتی تھی۔
میری لغاری صاحب سے پہلے کی علیک سلیک تھی، انکو جب میں نے خان بہادر صاحب کے ارادے سے آگاہ کیا تو اپنی علم دوستی کی وجہ سے خوش ہوئے اور کہا کہ میں ان کے مکتب سے اپنے من پسند طالبعلم بعدازاں امتحان کے اپنے اسکول میں داخل کروں۔ میں نے ابتدائی طور پر امتحان کے بعد پانچ طلبہ منتخب کیے، جن میں سے ایک خود میاں محمد حسن کے فرزند تھے۔ میاں صاحب نے یہ پانچوں طلبہ کتابوں اور بستر سمیت میرے حوالے کئے اور انکے کھانے کیلئے چاول کی بھی اچھی خاصی مقدار بھی دی۔ یہ پانچوں طلبہ اپنے ساتھ لاکر میں نے یکم جنوری 1920 کو اسکول کا باضابطہ افتتاح کیا۔
خان بہادر صاحب نے ان لڑکوں کیلئے انگریزی پہلی جماعت کی کتابیں منگوانے کا حکم دیا، ایک ہفتے کے اندر ان کتابوں کی بلٹی حیدرآباد سے آگئی جسکی میر صاحب نے فوری طور پر ادائیگی

کردی۔ یہ طلبہ میرے مہمان خانے میں رہتے تھے جبکہ انکا کھانا بھی میرے گھر پر ہی تیار ہوتا تھا، بعدازاں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ شہر کے ہندو اور مسلمان لڑکے بھی اسکول میں داخل ہو گئے اور جب پندرہ سولہ پردیسی طالب علم ہو گئے تو میر صاحب نے اسکول کے قریب ہی ایک اور جگہ بورڈنگ ہاؤس کیلئے کرائے پر حاصل کی اور ایک باورچی کو کھانا پکانے پر مامور کیا۔ بورڈنگ ہاؤس کے روزمرہ کے اخراجات کا اندراج کیا جاتا تھا جو کہ ہر مہینے کے آخر میں میر صاحب کو پیش کیا جاتا اور ان سے اگلے ماہ کے اخراجات حاصل کئے جاتے۔

مرحوم میر صاحب بھی اکثر کہتے تھے کہ خرچہ میرا اور محنت اور ایمانداری تمھاری، بس کام میں کبھی بھی سستی نہیں کرنی ہے!!

1921ء کی ابتداء میں اسکول میں چالیس کے قریب طالبعلم ہو گئے، جن میں سے دس کے قریب شہر کے تھے جبکہ باقی ماندہ باہر کے تھے۔ اس وقت پندرہ ذہین طالبعلم انگریزی دوسری جماعت میں تھے جبکہ پچیس پہلی جماعت میں۔ میں نے میٹرک میں فیل ہونے والے ایک جاننے والے غریب طالبعلم کو حیدرآباد سے بلوا کر اپنا نائب مقرر کیا، بورڈنگ ہاؤس کی ذمہ داری بھی اسی کے ذمے تھی۔

مارچ 1921ء میں کمشنر سندھ مسٹر ریوگشت کے دوران ٹنڈو باگو بھی آئے تھے، میر صاحب نے اس سے کچھ دن قبل مجھے اپنے ہاں بلوا کر مشورہ کیا کہ، " کمشنر صاحب کو لا کر اسکول کا معائنہ کرایا جائے اور اسکول کے مستقبل سے متعلق دو تین گذارشات کر کے امداد مانگی جائے۔" مجھے میر صاحب کی یہ رائے بہت پسند آئی۔ میر صاحب نے مجھے کچھ پیسے عنایت کئے تاکہ اسکول کو محرابی جھنڈیوں وغیرہ سے سجایا جائے۔ یہ کام سرانجام دینے کے بعد میں نے اسکول کے طلبہ کو علم اور مالک والا مکالمہ یاد کرایا، اسکے علاوہ انکو مرحبائی گیت اور شہنشاہ کی دعا بھی اچھے سروں کے ساتھ ذہن نشین کرائی۔

کمشنر صاحب کے ٹنڈو باگو پہنچنے کے اگلے روز میر صاحب انہیں اسکول لیکر آئے۔ کمشنر صاحب سندھی سمجھتے اور بولتے تھے۔ وہ اسکول میں سادہ کپڑوں میں ملبوس دیہاتی لڑکے دیکھ کر خوش

ہوئے، انہیں مکالمہ اور دعائیہ گیت بھی پسند آیا۔ انہوں نے سال دوئم کے طلبہ سے انگریزی میں آپکا نام کیا ہے؟ تمھارے والد کا نام کیا ہے؟ کس جماعت میں پڑھتے ہو؟ جیسے کچھ آسان سوالات بھی کئے اور انکے جوابات پا کر مسرور ہوئے۔ میر صاحب کی گذارش پر وہ بورڈنگ ہاؤس دیکھنے بھی چلے اور دوبارہ اسکول آ کر حاضری رجسٹر کا معائنہ کیا جو کہ سفید کاغذ پر لکیریں کھینچ کر بنایا گیا تھا، بعدازاں انہوں نے بورڈنگ ہاؤس میں ہونے والے اخراجات کا گوشوارہ طلب کیا جو کہ انہیں تحریری صورت میں پیش کیا گیا۔ بعد میں انہوں نے مہمانوں کی کتاب طلب کی جو بھی سفید کاغذ پر پکی جلد کے ساتھ موجود تھی۔ انہوں نے اس کتاب کے ابتدائی دو صفحات میر صاحب کی دریادلی کی تعریف میں لکھے، جنہوں نے زیریں سندھ جیسے پس ماندہ علاقے میں اچھے انتظامات کے ساتھ انگریزی اسکول کا اجراء کیا تھا جس پر انہوں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

میر صاحب نے اسکول کے مستقبل سے متعلق جو تین بنیادی ضروریات پیش کی تھیں انکی انہوں نے زوردار الفاظ میں تائید کی۔ خان بہادر میر صاحب نے اسکول کی بہتری کیلئے جو تین ضروریات پیش کیں وہ یہ تھیں، (1) اسکول رجسٹرڈ ہو (2) ماسٹر محمد صدیق سرکاری ملازم ہے، ان کی خدمات باقاعدہ طور پر اس اسکول کو تفویض کی جائیں اور (3) میں (میر صاحب) ایک مناسب رقم محکمہ تعلیم کے انڈوومنٹ فنڈ میں جمع کراؤں، اس فنڈ کے سود سے ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کے اخراجات اٹھائیں۔

کمشنر صاحب مہمانوں کی کتاب میں اپنے تاثرات تحریر کر کے اور میر صاحب کی منگوائی مٹھائی کے ڈبے اپنے ہاتھوں سے طلبہ میں تقسیم کرنے اور باقی بچ جانے والے ڈبے میرے حوالے کرنے کے بعد خیر و خوبی سے اپنے بنگلے کو روانہ ہوئے۔

کمشنر صاحب کی ٹنڈو باگو سے روانگی کے اگلے روز میر صاحب میرے اور مہمانوں کی کتاب سمیت کراچی روانہ ہوئے۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ 1920ء کے اختتامی ایام میں مسٹر نورالدین نانا صاحب ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ مقرر ہوئے تھے، جن سے میری علیک سلیک اس زمانے سے تھی جب وہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں نائب استاد تھے اور میں پریکٹسنگ اسکول میں۔

مسٹر ناناصاحب کے پرسنل اسسٹنٹ مقرر ہونے کے بعد انہوں نے مجھ پر ایک احسان تو یہ کیا کہ مجھے ایک فرلو چھٹی کے بعد دوسری فرلو چھٹی ملنے میں کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی اور میں ہر ماہ ایک دو مرتبہ کراچی جا کر نئے شروع کیے گئے انگریزی اسکول سے متعلق انکے مشورے اور ہدایات حاصل کرتا۔ اس سے بھی بڑا احسان انہوں نے میرے خلاف دیوان پریم چند صاحب پرنسپل کی رپورٹ پر میرا تبادلہ، جو ٹریننگ کالج سے گوٹھ ھبھارا تحصیل میر پور ساکرو ہوا تھا، وہ میری فرلو چھٹی کے دوران ہی رد کرا کے اسی جگہ بہتر تنخواہ اور حقوق کے ساتھ ٹریننگ کالج میں تقرری کا حکم نامہ بجھوا دیا۔ مرحوم خان بہادر میر صاحب نے مجھے ٹریننگ کالج جانے نہیں دیا، اس لئے ناناصاحب کے مشورے کے مطابق حکم کی فوری بجا آوری کے طور پر ایک ہفتے تک ٹریننگ کالج رہا اور پھر سے فرلو چھٹیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

مندرجہ بالا کمشنر صاحب کے تاثرات لیکر خان بہادر میر صاحب کے ساتھ جب میں کراچی گیا تو میر صاحب نے انگریزی میں ایک طویل درخواست ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب کے نام ٹائپ کرائی جبکہ کمشنر صاحب کے تاثرات بھی ٹائپ کرا کے اس میں شامل کر دیئے۔ درخواست میں خاص طور پر تین باتوں پر زور دیا گیا تھا، (1) اسکول رجسٹرڈ ہو، (2) مسافر کی ملازمت قواعد کے تحت مستعار کی جائے، اور (3) انڈوومنٹ فنڈ حکومت اپنے پاس رکھے اور اسکے سود سے ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب اسکول کے بورڈنگ ہاؤس کے اخراجات ادا کریں۔

یہ درخواست میر صاحب اور میں ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب کے دفتر لے گئے، پہلے تو ناناصاحب کے دفتر میں انکے ساتھ کوئی آدھے گھنٹے کی بات چیت ہوئی، بعد ازاں ناناصاحب میر صاحب کو مسٹر کنٹریکٹر صاحب (پارسی) ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب کے بالائی منزل پر واقع دفتر لے گئے، آدھے گھنٹے کے بعد دونوں خوش وخرم واپس آئے۔ ناناصاحب نے امید بندھائی کہ انشاء اللہ تعالیٰ آپکی تینوں ضروریات جلد پوری ہو جائیں گی۔

ہمارے کراچی سے واپس آنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد حیدرآباد ضلع کے ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب نے اپنا نائب ٹنڈو باگو بھیجا، جس نے دستور کے مطابق قائم شدہ اسکول کے طالبعلموں کا

امتحان لیا اور پہلی جماعت کے چودہ طلبہ کو پاس کر کے دوسری جماعت جبکہ دوسری جماعت کے بارہ طلبہ کو کامیاب قرار دے کر تیسری جماعت میں داخل کیا۔ انہوں نے اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کا ریکارڈ بھی دیکھا اور مستقبل کیلئے تمام تر ریکارڈ محکمہ جاتی انداز میں مرتب کرنے کا مشورہ دیا۔

بعد ازاں انہوں نے میر صاحب سے ملاقات کر کے یقین دہانی کرائی کہ ان کا اسکول جلد ہی رجسٹرڈ ہو جائے گا اور کچھ ہی عرصے کے بعد اس ضمن میں تحریری حکم نامہ میر صاحب کو موصول بھی ہو گیا۔

میر صاحب نے حاضری کا رجسٹر، جنرل رجسٹر، مہمانوں کی کتاب، آمدن اور اخراجات کا رجسٹر، روزنامچہ، رسید بک وغیرہ حیدرآباد کی پریس سے شائع کرا کر میرے حوالے کیں جن پر اندراج کا عمل شروع کیا گیا۔

جولائی 1921 میں خان بہادر میر صاحب کو ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب کی جانب سے ایک اور حکم نامہ موصول ہوا کہ، "محمد صدیق کی خدمات آپکو مستعار کی جاتی ہیں، جس تنخواہ (ستر روپے ماہانہ) پر وہ ٹریننگ کالج سے فرلو چھٹیوں پر ہیں، وہ تنخواہ انکو دی جائے جبکہ پانچ روپے سالانہ اضافہ جیسا کہ ٹریننگ کالج میں انکا حق تھا بھی ہر سال انکو فراہم کیا جائے۔ انکا پنشن فنڈ آپ سے وقفے وقفے سے وصول کیا جائے گا۔"

مندرجہ بالا دونوں احکامات آنے کے بعد خان بہادر میر صاحب نے جنگی قرضے کے طور پر ایک لاکھ روپے جو 1914 کی جنگ عظیم کے دوران حکومت کو دیئے تھے اور جو آج تک انہوں نے واپس نہیں لئے تھے، وہ سود سمیت ایجوکیشنل انسپکٹر کو دلوائے اور مزید رقم کی بھی جلد ادائیگی کا وعدہ کیا۔ انہوں نے تحریری طور پر درخواست کی کہ اس انڈوومنٹ فنڈ سے ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کے اخراجات کریں اور جو سرکاری امداد اور ڈسٹرکٹ لوکل گورنمنٹ امداد اسکول کو ہر سال ملتی ہو، وہ بھی اس فنڈ میں شامل کی جائے۔

یہ انتظام ہو جانے کے بعد 1922 کی ابتداء میں میر صاحب نے اسکول کی نئی عمارت کی تعمیر کا

کام شروع کرایا، جس میں آج تک ہائی اسکول قائم ہے۔

1923ء میں موجودہ عمارت کا خاصہ حصہ یعنی پانچ کلاس رومز، ہیڈ ماسٹر کا دفتر، اساتذہ کا کمرہ، بورڈنگ ہاؤس کی شمالی پٹی اور باورچی خانہ، کھانے کا کمرا، پردیسی اساتذہ کے رہائشی کوارٹرز اور جامع مسجد کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ خان بہادر میر صاحب نے اسکول کا نام "لارینس مدرسہ" رکھا جبکہ مکمل ہونے والی بورڈنگ ہاؤس کی پٹی کا نام " گبسن بورڈنگ ہاؤس" رکھا۔

لارینس صاحب کسی زمانے میں سندھ کے کمشنر تھے جبکہ گبسن صاحب حیدرآباد کے کلیکٹر تھے اور ان دونوں صاحبان سے میر صاحب کے دوستانہ مراسم رہے تھے۔

جنوری 1924ء میں میر صاحب نے مجھے حکم دیا کہ اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کی کرائے کی جگہیں چھوڑ کر نئی تیار شدہ عمارت میں اسکول شروع کیا جائے۔ نئی عمارت میں دفتر کا فرنیچر وغیرہ نیا بنوایا گیا تھا، بورڈنگ ہاؤس میں نئی چارپائیاں بھی فراہم کی گئیں تھی۔ بعدازاں طلبہ اور اساتذہ کی تعداد میں اضافے کے مطابق میر صاحب عمارت میں بھی اضافہ کرتے گئے اور اس طرح یہ آج کی اسکول عمارت وجود میں آئی۔

نئی عمارت کی جو امداد میر صاحب کو موصول ہوئی وہ بھی انہوں نے انڈوومنٹ فنڈ میں جمع کرادی جبکہ مزید ایک لاکھ روپے نقد بھی ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب سے کراچی میں بالمشافہ ملاقات کر کے دیے، اس طرح انڈوومنٹ فنڈ کی کل رقم ڈھائی لاکھ روپے ہوگئی۔

اپریل 1924ء سے اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کے تمام اخراجات ہر ماہ ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب سے موصول ہوتے رہے۔ ماہانہ اخراجات کے بل انہیں ارسال کئے جاتے جبکہ سال میں ایک مرتبہ اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کے گوشوارے انکا ایک کلرک آکر دیکھتا تھا۔ امتحانات بھی محکمہ تعلیم کے افسران لیتے تھے، تیسری جماعت پاس کرنے والے طالبعلموں میں سے غریب بچوں کو مزید تعلیم کیلئے میر صاحب اپنے خرچے پر سندھ مدرسہ کراچی یا گورنمنٹ ہائی اسکول حیدرآباد بھیجتے تھے۔ بورڈنگ ہاؤس میں جو تعداد ہر سال ایجوکیشنل انسپکٹر مقرر کرتے تھے، اس سے اضافی تعداد کے غریب طالبعلموں کے اخراجات میر صاحب اٹھاتے تھے۔ علاوہ ازیں غریب پردیسی

طالبعلموں کو کپڑے اور کتابیں بھی میر صاحب کی جانب سے عنایت ہوتیں۔

1925ء کی ابتداء میں میر صاحب نے اسکول میں چوتھی جماعت پڑھانے کی اجازت طلب کی جو کہ منظور ہوگئی تاہم ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب نے زور دیا کہ اب اسکول کا ہیڈ ماسٹر کسی گریجویٹ کو ہونا چاہیے۔ اگرچہ میر صاحب نے میری ہیڈ ماسٹری برقرار رکھنے کیلئے زور دیا لیکن ایجوکیشنل انسپکٹر نہیں مانا اور ایک گریجویٹ ہیڈ ماسٹر مقرر کیا، جنہوں نے اپریل 1925ء میں مجھ سے چارج لیا اور میں فرسٹ اسسٹنٹ اور بورڈنگ ہاؤس کا منیجر ہوگیا۔ جو اسکول میں نے پانچ طالب علموں اور پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پر شروع کیا تھا اب اس میں ڈیڑھ سو طالب علم اور سات اساتذہ تھے۔ اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کے ماہانہ اخراجات گیارہ سو روپے تھے، بابتر فری بورڈ تھے اور ہر فری بورڈ کو ماہانہ دس روپے اخراجات کے ملتے تھے۔

کچھ عرصہ فرسٹ اسسٹنٹ کے طور پر گذارنے کے بعد، میں نے میر صاحب کی منت سماجت کر کے ان سے اجازت لی اور سرکاری ملازمت میں واپس جانے کی درخواست دائر کی، جو منظور ہو گئی اور میرا تبادلہ شکارپور گورنمنٹ ہائی اسکول میں بطور نائب استاد کردیا گیا۔ فروری 1927ء میں شکارپور جا کر اپنی تقرری والے اسکول میں حاضر ہوا، جہاں میں نے چوتھی جماعت سے لیکر ساتویں جماعت تک فارسی اور سندھی پڑھانا شروع کی۔

ساتویں منزل۔ پردیس میں آخری ملازمت:

شکارپور شہر میرا پہلے سے دیکھا ہوا نہیں تھا البتہ دو تین ایسے پرانے شکارپوری استاد ضرور تھے، جو ٹریننگ کالج میں تعلیم کے دوران میرے ہم جماعتی تھے جبکہ کئی ایسے نوجوان اساتذہ بھی تھے جو میرے ٹریننگ کالج میں فارسی کے استاد ہونے کے دنوں میں میرے طالب علم رہے تھے اس لئے شکارپور میں بود و باش کے لحاظ سے میں نے اچھا وقت گزارا تاہم زیریں سندھ سے تعلق ہونے کی وجہ سے میں شکارپور کی گرمی اور سردی کا جو مزہ چکھا وہ زندگی بھر فراموش نہیں کرسکتا۔

میں نے مسلسل بارہ مہینے شکارپور میں گذارے تو اس دوران نورالدین نانا صاحب، ٹریننگ کالج

حیدرآباد کے پرنسپل مقرر ہوگئے، جنہوں نے مئی 1928 میں میرا تبادلہ دوبارہ ٹریننگ کالج میں کرایا۔ حیدرآباد تو ایک طرح سے میرا وطن ثانی رہا تھا، اس لئے گاؤں سے بیوی اور بچے بھی حیدرآباد منتقل کر کے وہاں رہنے لگا۔

مسلسل دوسال تک ٹریننگ کالج میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے کے ساتھ نانا صاحب کے پاس درسی کتب کا جائزہ لینے کی وہ خدمت بھی بجالاتا رہا، جو خدمات سابقہ ہندو پرنسپل صاحبان کے پاس بجا لاتا تھا۔ اسکے علاوہ نانا صاحب کے فرزند فیروزالدین نانا کو، جو اس وقت بی اے کے طالب علم تھے اور آج کل خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے سیشن جج ہیں، کو خانگی طور پر فارسی کی تعلیم بھی دیتا تھا۔

مئی 1928 کے اواخر میں جب میں تیسری جماعت کے طلبہ کو شاہ لطیف کی شاعری سمجھا رہا تھا تو اچانک خان بہادر میر صاحب اسلام وعلیکم کہتے ہوئے میری کلاس میں داخل ہوئے۔ خیر مقدم کرتے ہوئے میں نے انہیں کرسی پر بٹھایا تو کہنے لگے، "میں بیٹھا ہوں، تم کلاس مکمل کرلو" میں طلبہ کو شاہ لطیف کے ابیات سمجھاتا رہا جو وہ یکسوئی کے ساتھ سنتے رہے۔ پیریڈ مکمل ہونے کے بعد وہ بھی میرے ساتھ کلاس روم سے باہر آئے اور کہنے لگے، "شام کو میرے مہمان خانے پر آکر ضرور ملو۔"

شام کو میں میر صاحب سے انکے مہمان خانے پر جاکر ملا تو فرمانے لگے، "صبح نانا صاحب سے ملاقات کے بعد تمھاری کلاس میں آیا تھا۔ میں نے لڑکیوں کے اسکول کے لئے پکی اینٹوں کی ایک عمارت تیار کرائی ہے۔ میری خواہش ہے کہ چونکہ تمھاری پنشن کا وقت آگیا ہے، اس لئے چھٹی لیکر یہ اسکول شروع کرو اور وہیں سے پنشن کی درخواست دو تاہم نانا صاحب کو یہ بات قبول نہیں ہے، اس لئے فی الحال ایک تربیت یافتہ خاتون استاد کا بندوبست کر و جو یہ اسکول شروع کرے۔ ہم انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے اور ہر طرح انہیں مطمئن رکھیں گے۔"

میر صاحب کو اس ضمن میں امید دلا کر میں اسکول کیلئے خاتون استاد کی تلاش میں لگ گیا۔ حیدرآباد کی ایک تربیت یافتہ خاتون استاد جو خواتین کے ٹریننگ کالج کے پریکٹسنگ اسکول میں ٹائپ استاد تھیں، کو میں نے ٹنڈو باگو منتقل ہونے پر رضامند کرلیا کیونکہ انکے چچا کے ساتھ میرا بھائیوں

جیسا تعلق تھا۔ اس خاتون سے تبادلے پر رضامندی کی درخواست لیکر انکے کالج کی لیڈی سپرنٹنڈنٹ صاحبہ سے اس پر نوٹ لکھوایا اور میر صاحب کی جانب سے ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب کے نام درخواست لیکر کراچی روانہ ہوگیا۔ ایجوکیشنل انسپکٹر صاحب سے اس خاتون کے تبادلے کا حکم نامہ لیکر ان کے حوالے کیا تو وہ اپنے خاندان (شوہر، دو بچے، شوہر کے تین چھوٹے بھائی جو اسکول کے طالب علم تھے اور شوہر کی ایک بہن جو سندھی کی پانچ جماعتیں پڑھ چکی تھی) کو لیکر ٹنڈو باگو آگئیں اور یکم اگست 1928 کو لڑکیوں کا اسکول شروع کردیا۔ میر صاحب کے خاندان نے اس خاتون استاد کا ایسا مناسب خیال رکھا کہ نہ صرف وہ بلکہ انکے عزیز واقارب بھی مطمئن رہے۔

نیا اسکول شروع کرنے میں اس خاتون کو فقط ایک دقت پیش آئی، وہ یہ کہ خواتین کے ٹریننگ کالج کے پریکٹسنگ اسکول میں انہیں صرف لڑکیوں کی حاضری کا رجسٹر رکھنا ہوتا تھا جبکہ ٹنڈو باگو کے اسکول میں انہیں اسکول کا پورا دفتر یعنی حاضری کا رجسٹر، جنرل رجسٹر، آمدن اور اخراجات کا گوشوارہ، روزنامچہ، رسید بک وغیرہ سنبھالنا پڑ رہا ہے۔ خاتون نے اپنی اس دقت سے مجھے آگاہ کیا جو میں نے تین چار ماہ بعد موسم سرما کی تعطیلات میں ٹنڈو باگو آکر انکو سمجھا دیا۔ بعد میں بھی اگر انہیں کوئی دقت پیش آتی تو وہ کاغذات مجھے حیدرآباد ارسال کرتیں جنکو میں ٹھیک کر کے انہیں واپس بھیج دیتا تھا۔

آٹھویں منزل۔ پنشن اور متفرقہ حالات:

الف۔ شومئی قسمت:

فروری 1930 میں میرے مربی ماموں حاجی محمد عارف، جنہوں نے مجھے اپنے بیٹوں کی طرح پالا تھا، جو میری جانب سے برادری کے مکھیا ہونے کے فرائض سرانجام دیتے تھے اور میرے غریبانہ گھر وغیرہ کی نگرانی بھی کرتے تھے، انتقال کر گئے۔ انکے سخت بیمار ہونے کی اطلاع ملتے ہی میں اپنے خاندان سمیت ٹنڈو باگو پہنچ گیا، جس کے دو روز بعد انکا انتقال ہوا۔ اس قضیے کے موقعہ پر حسب معمول قرب وجوار کے عزیز واقارب اور برادری کے لوگ جمع ہوئے تو سب نے

مجھ پر زور ڈالا کہ چونکہ اب تک تو یہ بزرگ موجود تھے، اس لئے مجھ پر برادری کی کوئی خاص ذمہ داری نہیں تھی لیکن اب مجھے اپنے وطن میں رہنا اور برادری کی خوشی اور غمی کے امور کا انتظام سنبھالنا ہوگا۔

دوسری جانب خان بہادر میر صاحب کا بھی اصرار تھا کہ میں اب فرلو چھٹی لیکر پنشن کی کوشش کروں اور وطن میں رہتے ہوئے نئے شروع کئے گئے لڑکیوں کے اسکول کے انتظامات اور تعلیم میں خاتون استاد کا ہاتھ بٹاؤں۔

تمام باتوں پر غور وخوص کرنے کے بعد میں نے وطن میں رہنا مناسب سمجھا، اس لئے فرلو چھٹی کی درخواست ارسال کی اور اسکے ساتھ ہی پنشن کی درخواست بھی دائر کردی۔ حیدرآباد جاکر میں نے تمام صورتحال سے خان بہادر نانا نورالدین صاحب کو بھی آگاہ کیا، جنہوں نے میرے فیصلے کی تائید کی۔ اس وقت سے پردیس کی ملازمت سے تمام تر تعلق ختم کرکے وطن میں گذارنے لگا ہوں۔

ب۔ وطن کی لڑکیوں کی تعلیمی خدمت:

یہ بھی میں نے اپنی خوش بختی سمجھی کہ ایک جانب اپنی آبائی پگداری کے بردارانہ فرائض کی ادائیگی کا موقعہ مل رہا تھا، جو خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے آج تک بخوبی نبھا رہا ہوں تو دوسری جانب وطن میں لڑکیوں کی بیش بہا تعلیمی خدمت میں اپنے سچے وطن پرست خیر خواہ مربی خان بہادر میر صاحب کے شانہ بشانہ ہوکر کھڑے ہونے کا بانصیب موقعہ مل رہا تھا۔

خاتون استاد (مائی کھتو احمد یونسانی) بھی میرے وطن واپس آنے پر خوش تھیں۔ وہ مجھے اپنے والد کی جگہ سمجھتی تھیں اور میں بھی اسے اپنی سگی بیٹی سمجھتا تھا۔ آج تک شفاف من اور سچی خیر خواہی کے ساتھ میرے اور اسکے درمیان باپ اور بیٹی کا یہ رشتہ قائم ہے۔ آج کل وہ ٹنڈو قیصر میں لڑکیوں کے اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہیں اور جلد ہی ریٹائرڈ ہونے والی ہیں۔

خان بہادر میر صاحب نے مجھ سے فرمائش کی ہوئی تھی کہ میں روزانہ دو ڈھائی گھنٹے اسکول میں

خاتون استاد کی لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں مدد کروں اور اسکول کے انتظامی امور میں اسکا ہاتھ بٹاؤں۔ میر صاحب نے اپنے دیرہ والوں اور دیگر میر صاحبان کی چھوٹی بڑی بچیوں کو اس طرح کی ہدایت کردی تھی کہ یہ تمام لڑکیاں مجھے اپنا بزرگ سمجھ کر حجاب کے بغیر اسکول میں مجھ سے تعلیم حاصل کرتی تھیں اور میں بھی انہیں اپنا بچہ سمجھ کر پوری ایمانداری سے تعلیم دیتا رہا۔

شہر کی دیگر برادریوں کے تمام معززین کی لڑکیاں بھی اسکول میں داخل ہونے لگیں۔ جوں جوں اسکول میں لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، محکمہ جاتی طور پر وہاں نائب خاتون اساتذہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ غریب والدین کی بچیوں کو کتابیں اور دوسرا تعلیمی سامان خان بہادر میر صاحب کی جانب سے ملتا تھا۔ اسکول کے پہلے دن سے قرآن پڑھانے والی ایک استانی میر صاحب نے تنخواہ پر رکھی تھی بعد میں اس خاتون کو بھی سرکاری طور پر چار روپے اور پانچ روپے تنخواہ ملنا شروع ہوگئی تاہم میر صاحب نے اپنی ابتدائی نوازش برقرار رکھی۔ مسکینوں پر میر صاحب کے جو احسانات رہے ہیں انکی ادائیگی سے میری زبان قاصر ہے۔

محکمہ تعلیم کے اہلکار (ایجوکیشنل انسپکٹر تک) اور محکمہ ریونیو کے اہلکار (کمشنر تک) لڑکیوں کا اسکول دیکھ کر انتہائی خوش اور مطمئن ہوتے اور مہمانوں کی کتاب میں شاندار تاثرات تحریر کرکے جاتے تھے۔ کچھ اہلکار اپنے تاثرات میں میری خانگی خدمت کی بھی تصدیق کرتے تھے۔

اس اسکول کی ترقی کیلئے خان بہادر مرحوم نے ایک اور شاندار قدم اٹھانے کا مصمم ارادہ کیا کہ ایک موٹر گاڑی کا انتظام کیا جائے جو گرد و نواح کے دیہات میں رہنے والی لڑکیوں کو صبح اسکول لے آئے اور پڑھائی ختم ہونے پر انکو اپنے گھر چھوڑ آئے اور دوسرا یہ کہ لڑکیوں کیلئے ایک بورڈنگ ہاؤس تعمیر کرایا جائے جس میں بیرون شہر کی لڑکیوں کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام کیا جائے۔

افسوس کہ خان بہادر مرحوم ان ارادوں کو پایہ تکمیل پر نہیں پہنچا سکے اور 12 فروری <u>1932</u> کو انکی نیک روح کو دارلبقاء سے بلاوا آگیا اور وہ چل بسے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خان بہادر میر صاحب کی وفات کے بعد بھی یہ اسکول "گورنمنٹ پرائمری گرلز اسکول" کے نام سے چل رہا ہے۔ خدا تعالیٰ کی کرم نوازی ہے کہ پچھلے پانچ چھ برسوں سے اس اسکول کی

ہیڈ مسٹریس، نائب استانیاں اور قرآن ٹیچر اس گاؤں کی ہی تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ لڑکیاں ہیں جو کہ یکے بعد دیگرے ذمہ داریاں سنبھالتی رہی ہیں، جنہوں نے پہلی جماعت سے اسی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ میں بھی تاحال بلا کسی معاوضے اور لالچ کے، ان بچیوں کے ساتھ اسکول کی ترقی، انتظامات اور تعلیم میں مددگار اور رہنما رہنا اپنا وطنی اور اخلاقی فرض سمجھتا ہوا آیا ہوں۔

ث۔ تصنیف اور تالیف کا کام:

1902 میں ٹریننگ کالج میں ملازمت شروع ہونے کے بعد میں نے اپنی فرصت کا زیادہ تر وقت کتابوں کا مطالعہ کرنے اور ترجمہ، تصنیف اور تالیف کے کاموں میں صرف کیا۔ ابتدائی کتابیں مسٹر ہری سنگھ بک سیلر سکھر اور مسٹر پوکرداس بک سیلر شکارپور کو بھیجتا تھا جو اس زمانے میں لیتھو پریس پر یہ کتابیں شائع کرتے تھے۔ ان دنوں کی شائع شدہ کتابوں میں سے مشکل سے ہی کوئی آج مل سکتی ہے۔ بعدازاں مسٹر مولچند وشنداس بک سیلر حیدرآباد نے اپنی کتابوں کی دکان شروع کی تو میں نے ان کیلئے کتابیں تیار کرنا شروع کیں۔ پھر جب سندھ مسلم ادبی سوسائٹی شروع ہوئی تو میں نے انکو اپنی کتابیں اشاعت کیلئے دینا شروع کیں، تاہم اب میری تصنیفات کا تمام تر کام حیدرآباد کے آر ایچ احمد اینڈ برادرس کے ساتھ ہے۔

میری کچھ اہم کتابوں کے نام ذیل درج ہیں:

1: سپاہی زادہ (اردو نظم کا سندھی میں منظوم ترجمہ)

2: ہدایت المسلمین (اسلامی عقائد اور ارکین کی تشریح، چھ جلدیں)

3: رموز القران (قرآن شریف کو درست طور پر پڑھنے اور علامات سے متعلق تشریح)

4: ناول گلبدن (اردو سے ترجمہ)

5: مہر وکز بانو (بھار دانش فارسی کے ایک حصے کا ترجمہ)

6: ممتاز دمساز (اردو سے ترجمہ۔ تک بندی کے ساتھ، جا بجا مضمون کی موافقت میں سندھی اشعار)

7: سندھی رہنما (سندھی کی دوسری کتاب سے ساتویں کتاب تک الفاظ کی معنی، اشتقاق اور شعروں کی تشریح، چھ جلدیں)

8: دیوان فاضل (سائیں فاضل شاہ مرحوم کی سوانح عمری سمیت)

9: قرب قلیچ (مرحوم شمس العلماء میرزا قلیچ بیگ صاحب کی مختصر سوانح عمری)

10: شہید کربلا یا شہادت نامہ

11: زندگی کا دور، حصہ اول اور دوئم (اردو سے ترجمہ)

12: سگھڑ عورتیں (فارسی کتابوں سے تالیف شدہ)

13: سندھی گرامر

14: سندھ کی تاریخ

15: سندھ کی جغرافیہ

16: سندھ کی کچھ تحصیلوں کی علیحدہ جغرافیہ

17: دیسی ریاضی

18: ورنیکیولر فائنل امتحان کے حل شدہ پیپر (1949 سے تاحال)

19: جوہر اسلام (صحابہ کرامؓ کے نیک اعمال، انگریزی سے ترجمہ)

20: جیومیٹری

21: ریاضی (دوسری جماعت کے کورس سے پانچویں جماعت کے کورس تک، چار جلدیں)

22: تجارتی حساب کتاب (نئے انداز کا دیسی حساب کتاب)

23: غلامی اور آزادی کے عبرت ناک نظارے (حبشی قوم کی غلامی اور آزادی کا تاریخی اور تمدنی احوال)

24: منتخب مضامین (نظم و نثر، تین جلدیں)

25: منازل مسافر بمعہ کلیات مسافر

مذہبی تعلیم وتربیت:

مکتب میں قرآن شریف کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران اپنے استاد مرحوم کے پیچھے نماز پڑھنے اورانہیں عشاء کے بعد ذکر کرتے دیکھ کر، گھر میں والد مرحوم کوعموماً آدھی رات کوذکر کرتا دیکھ کراور گھر میں انہیں اور ماموں حاجی عارف کونماز پڑھتادیکھ کر، استاد مرحوم اور رشتہ داروں کوروزے رکھتا دیکھ کر، دس برس کی عمر میں ہی مجھے نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کی عادت ہوگئی تاہم اس زمانے میں ان اعمال کی حقیقت اور روحانی اثرات کا کوئی علم نہیں تھا۔

ہمارے گاؤں کے میر صاحبان، ہمارے رشتہ دار، تمام تر پڑوسی پیر سائیں پاگارو کے مرید تھے اور آج تک انکے سچے مرید ہیں اور اپنے بچوں کوانکے بچپن میں ہی مرشد کی مریدی میں سونپتے ہیں۔اسی روایت کے تحت جب میں ابھی مکتب میں قرآن شریف سیکھ رہا تھا تو مجھے پیر پاگارو کے خاندان کے پیر علی صدر شاہ کا مرید بنایا گیا۔ جب پیر پگارو حسب معمول خلیفوں اور فقراء کے ساتھ ہمارے محلے میں زیارت کے لیے آئے تھے تو پیر صاحب چارپائی پر بیٹھے تھے جبکہ انکے تمام خلیفے، فقراء اور مرید ارد گرد بیٹھے تھے۔چارپائی کے سامنے بچھی ہوئی چٹائی پر مجھے نماز میں قعدہ کی حالت میں بٹھایا گیا۔ پیر صاحب ذکر کے چار الفاظ میں سے ایک ایک لفظ بولتے گئے جنہیں میں دہراتا رہا، پھر پیر صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور میری پیٹھ پر تھپکی دی۔میں نے حاضر لوگوں کے کہنے کے مطابق پیر صاحب کی قدم بوسی کی اور انکے ہاتھ چومے۔

اسکے بعد کبھی شام کی نماز کے بعد جماعت کے دیگر افراد کے ساتھ تو کبھی اپنے طور پر عشاء کی نماز کے بعد یا فجر کی نماز سے قبل یہ ذکر کرتا رہتا تھا تاہم مجھے اس ذکر کے حقیقی فوائد اور روحانی حالت کا اس زمانے میں بالکل معلوم نہیں تھا۔

ٹریننگ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران جب میں نے سندھی، اردو اور فارسی مذہبی کتب کا مطالعہ کیا اور استاد مرحوم سید محمد فاضل شاہ صاحب سے عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قرآن شریف کی معنیٰ کوسمجھا، تفسیر حسینی اور امام غزالی کی کتاب " کیمیائے سعادت " کومکمل طور پر پڑھا

اور سمجھا اور تصوف کے روحانی مسائل زبانی طور پر معلوم کر لیے تو معلوم ہوا کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے اور اس کے اراکین میں کون سا روحانی فلسفہ سمایا ہوا ہے اور ذکر کرنے سے کس طرح روحانی روشنی اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

مذہبی بحث مباحثے میں مرحوم سائیں فاضل شاہ کوعصری عالم اہمیت دیتے تھے۔وہ کئی ایک مخالفین کو مذہبی بحث مباحثہ کرتے ہوئے برسرے عام لاجواب بنا چکے تھے۔انکی ایک ہدایت یہ ہوتی تھی کہ اسلام کے مخالف مصنفین کی جوبھی کتب ہاتھ آئیں، ضرور پڑھنی چاہیں، جبکہ ان کتابوں کے جواب میں علماء کی لکھی گئی کتابیں بھی ہاتھ کر کے پڑھی جائیں تاہم اگر کسی مخالف کی کتاب کے جواب میں کوئی کتاب مل نہیں سکے تو انکے مکمل شافی جواب تفسیر حسینی اور کیمیائے سعادت میں مل جائیں گے۔

اس ہدایت کے تحت میں نے کئی ایک مسیحی اور آریاسماجی علماء کی تحریر کردہ کتابیں پڑھیں، جن میں اسلام کے اراکین اور اصولوں پر سخت نکتہ چینی اور حملے تھے تاہم خدا تعالی کے فضل وکرم سے ان نکتہ چینیوں اور حملوں کے تسلی بخش رد تفسیر حسینی میں جوقرآن شریف کی آیات کے روحانی راز سمجھائے گئے ہیں سے اور کیمیائے سعادت کی معنوں تشریحات سے اچھے طریقے سے مل جاتے تھے۔ان دنوں سے تاحال میرا مذہبی دستور العمل ذیل درج ہے، جسکی قرآن شریف اور تصوف کے اصول تائید کرتے ہیں۔

1: خدا تعالیٰ کی ہستی کوحق سمجھنا، اسے سب کچھ کر سکنے والا، ہر جگہ حاضر وناظر اور دانا وبینا سمجھنا اور ایمان کامل کے ساتھ ہر وقت اور ہر حال میں اسکے پاک نام کا ذکر کرتے رہنا۔

2: مقررہ اوقات پر اسکی عبادت کرنا، دل میں خشوع وخضوع کے ساتھ اسکی مدد اور توفیق طلب کرنا، جو کچھ عبادت میں پڑھا جائے وہ سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔جانے اور سمجھے بنا، یکسوئی کے ساتھ عبادت ناممکن ہے۔

3: روزانہ، بالخصوص بعد از نماز فجر قرآن شریف کی جتنی ممکن ہوسکے تلاوت کرنا اور جو پڑھا جائے اسکے معنیٰ سمجھنا اور من میں بٹھانا۔

4: جس رسول پاک ﷺ کی معرفت ہمیں خدا تعالیٰ کی پاک ہستی سے تعارف اور قرآن شریف کے احکامات پہنچے ہیں، ان پر ہر وقت بالخصوص دوران عبادت صلواۃ پڑھتے رہنا۔

5: مرشد سے حاصل ہونے والا ذکر کسی بھی وقت، بالخصوص مغرب اور عشاء کی نماز کے درمیانی وقفے میں یا سورج ابھرتے وقت کرنا اور سمجھنا کہ ذکر کے الفاظ میں دراصل ہے کیا۔ یہ ذکر ہی ہے جو روح اور رب کے درمیان سچا تعلق اور سچی محبت قائم کرتا ہے۔

6: دنیاوی کاموں میں اپنی حیثیت کے مطابق نیکی اور خیر کے کاموں کی کوشش کرتے رہنا اور بدی اور بدنیتی جیسے کاموں سے خود کو دور رکھنا۔ یہ خدائی نعمت اس وقت حاصل ہوگی جب ہر نماز میں خشوع و خضوع کے ساتھ "اھدنا صراط المستقیم ٭ صراط الذین انعمت علیھم " (یا اللہ تعالیٰ! ہمیں سیدھے راستے پر چلا جس راہ پر تو نے اپنے نوازے ہوئے بندوں کو چلایا)۔

7: کسی بھی دوسرے فرقے یا مذہب کے شخص سے نفرت اور دھتکار کا راستہ اختیار نہ کرنا، کسی بھی فرقے اور مذہب کا شخص ہو اس کے ساتھ دنیاوی لین دین اور کام کاج میں صاف دل اور صلح پسند بن کر چلنا چاہیے۔ مذہبی معاملات میں دشمنی اور نفرت کا کیا کام، جبکہ خدا تعالیٰ خود اپنے کلام پاک میں صاف صاف فرماتے ہیں:

الف: وان جادلوک فقل اللہ اعلم بما تعلمون ٭ اللہ یحکم بینکم یوم القیامہ فیما کنتم فی تختلفون (سورۃ الحج سپارہ 17 رکوع 8/15)

ترجمہ: (اے حضرت محمد ﷺ) اگر مخالف مذہب والے تمھارے ساتھ مذہب سے متعلق بحث کرتے ہیں تو انکو کہہ دو کہ جو تم کرتے ہو، وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ جانتا ہے، جن باتوں کی تم مخالفت کرتے ہو، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ خود ہی روز قیامت کو کرے گا۔

ب: وان ھذا امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون ٭ فتقطعوا امرھم بینھم زبرا کل ضرب بما لدیھم فرحون ٭ (سورۃ المومنون سپارہ 18 رکوع 2)

ترجمہ: اے نبیو! اے مذہبی پیشواؤ! تحقیق یہ جو بھی مذہبی فرقے ہیں وہ تمام تر ایک ہی مذہبی اصول کی تعلیم حاصل کرنے والی ٹولیاں ہیں اور میں تمھارا پالنہار ہوں، اس لئے میرا خوف کرو، پھر انہوں

نے آپس میں لڑائی جھگڑے کر کے اس مضبوط اور اصل اصول کو پارہ پارہ کر کے علیحدہ علیحدہ مذہبی فرقے بنا لئے ہیں اور ہر فرقے اپنے اختیار کئے ہوئے اصول پر نازاں ہے۔

ت: لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقط استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لھا واللہ سمیع علیم ٭ (سورۃ البقر، سپارہ 30 رکوع 33-1)

ترجمہ: سچ مچ گمراہی واضح ہے، اس لئے تبدیلی مذہب کیلئے کسی پر زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس صورت میں جو گمراہ کن طاقت سے خود کو آزاد کرا کے سچے اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ ایسی رسی کو پکڑتا ہے، جو کبھی نہیں ٹوٹے گی اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے اور سمجھنے والا ہے۔

ث: قل یا ایھا الکافرون ٭ لا اعبد ما تعبدون ٭ ولا انتم عابدون ما اعبد ٭ ولا انا عابد ما عبدتم ٭ ولا انتم عابدون ما اعبد لکم دینکم ولی دین ٭ (سورۃ الکافرون، سپارہ 30)

ترجمہ: "اے رسول کریم ﷺ کہہ دو کہ اسلام کو نہ ماننے والو! جن بتوں کو تم پوجتے ہو، ان کو میں نہیں پوجوں گا اور میں جس اللہ کی عبادت کرتا ہوں تم اسکی عبادت نہیں کرتے، اس لئے تم اپنے دین پر رہو اور میں اپنے دین پر محکم ہوں"

سبحان اللہ! غیر مذہب والوں کے ساتھ صلح شانتی سے چلنے سے متعلق حضرت محمد ﷺ کی زندگی مبارک کی کئی مثالیں موجود ہیں اور قرآن شریف کی کئی دیگر آیات بھی اسکی گواہ ہیں۔

عشق کی منزل:

محبت انسان کے من کا موتی ہے، جب الفت کی آگ کو فراق کی ہوا بھڑکاتی ہے تو یہ محبت عشق مجازی کہلاتی ہے، جس کا مطلب ہے ظاہری ہستی کی محبت کا سراب جس کا حقیقی منظر سے کوئی تعلق نہ ہو۔ کوئی بھی کامل مرشد یا استاد اپنے تجربے اور روشن قلب کے ذریعے مجازی عاشق کے روح کی مجازی خوبیوں اور خاصیتوں کی اصلیت اور حقیقت کی جانب رجوع کرتا ہے یا نقش سے ہٹا کر نقاش سے ملاتا ہے، تب یہ مجازی عشق تبدیل ہو کر عشق حقیقی کی صورت اختیار کرتا ہے، جو انسانی روح کیلئے بقا دار ثمر اور اصل مقصد ہے۔

کامل استاد مرحوم سید محمد فاضل شاہ کی صحبت اور فیض بخشی سے قبل الہڑ پن میں میرے من کو جو مجازی عشق کی چوٹ آئی تھی، اسکا اثر تو اس تجربہ کار استاد کی فرمائشوں اور ہدایات سے زائل ہو گیا لیکن انکی وفات کے بعد عشق مجازی نے میری روح پر جو سخت حملہ کیا تھا، اسکو بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے اس مرحوم کامل استاد کی ہدایات کی یاد آوری نے زیادہ عرصے ٹھہرنے نہیں دیا۔ حق تعالیٰ جل شانہ کی تائید موجودہ حقیقی راہ پر آخر دم تک ثابت قدم رکھے، آمین ثم آمین۔

شادیاں اور اولاد:

میری پہلی شادی اپنی برادری میں ٹنڈو محمد خان میں ہوئی۔ چونکہ بارات کو ٹنڈو باگو سے آنا تھا، چنانچہ کافی اخراجات ہونے تھے، جس کے پیش نظر سرگواسی دیوان تاراچند شوقی رام آڈوانی پرنسپل صاحب نے اپنے طور پر پیسوں کے معاملے میں میری کافی مدد کی، جس کی وجہ سے یہ شادی خیر وخوبی سے ہوگئی۔ یہ شادی اپریل 1905 میں ہوئی تھی، اس بیوی سے میری ایک بیٹی پیدا ہوئی جو پیدا ہونے کے فوراً بعد انتقال کرگئی۔ میری یہ بیوی بھی نومبر 1906 میں انتقال کرگئی۔

میری دوسری شادی ٹنڈو باگو سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر واقع گاؤں پاھڑمری کی اپنی ایک عزیزہ سے مارچ 1910 میں ہوئی۔ اس بیوی سے میرے تین بیٹے اور چھ بیٹیاں کل نو بچے ہوئے۔ دسمبر 1930 میں جب میری اس بیوی کا انتقال ہوا تو ان نو بچوں میں سے فقط دو بیٹیاں زندہ تھیں، جن میں سے بڑی بیٹی کا بیاہ تلہار میں رہائش پذیر ہمارے رشتہ داروں میں ہوا ہے، جس کی ایک بیٹی زندہ ہے، جو تلہار میں اپنے ددھیال میں رہتی ہے اور اپنے گھر پر لڑکیوں کو قرآن شریف کی تعلیم دیتی ہے جبکہ اسکی چھوٹی بہن کنواری ہی چل بسی تھی۔

میں نے تیسری شادی پنشن لینے کے دنوں میں اپنے پڑوسی رشتہ داروں کے ہاں اپریل 1932 میں کی۔ اس شادی سے مجھے میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی بچپن میں ہی فوت ہو گئے باقی ایک بیٹی جو ستمبر 1934 میں پیدا ہوئی وہ اپنے خاندان اور ایک بیٹے کے ساتھ خوش وخرم زندگی گذارتے ہوئے لڑکیوں کے مقامی اسکول میں استانی ہے جبکہ دوسرا فرزند جو

مارچ 1940 میں پیدا ہوا، وہ اس وقت انگریزی کی دوسری جماعت کا طالب علم ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ انکو علم اور فضیلت کا خزانہ بخشے اور بخت سکندرہ اور عمر خضری عطا کرے (آمین)

اب میں زندگی کا چوہتروا‌ں سال مکمل کر رہا ہوں، خداوند کریم جل شانہ اپنے فضل وکرم سے میرا بقیہ عرصہ ایمان کی سلامتی اور کسی کی محتاجی کے بغیر گذار دے، آمین۔

آخرت دنیا سے افضل یا خدا
کرنا بحق حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ

آمین ثم آمین

یوں تو ناچنا اور گانا نہ صرف انسانی بنیادی فطرت کا حصہ ہے بلکہ اس کی روحانی ضرورت بھی ہے۔ مگر مادر وطن سے ہزاروں میل دور غلامی کی ذلت آمیز زندگی میں دھنس جانے کے بعد افریقی شیدیوں کیلئے ان کے ناچ اور گانے بچھڑے ہوئے خاندانوں کی یاد کو تازہ رکھنے، آزادی کی اُمنگ کو زندہ رکھنے اور غلامی کی کٹھن زندگی کو کاٹنے کا واحد سہارا بن کر رہ گئے۔ وہ درد بھری موائیاں گا کر اپنی قبائلی اور خاندانی شناخت کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے تاکہ ایک دن بچھڑے ہوئے میت انہیں پہچان سکیں، مگر صدیوں پر محیط غلامی کے دور میں شاید ہی کسی غلام کی یہ اُمید پوری ہوئی ہو۔

سندھ کے شیدیوں نے بھی افریقہ سے بچھڑ جانے کے بعد صدیوں اپنے مخصوص ناچ کو جاری رکھا جسے وہ موگرمان کہتے ہیں۔ موگرمان کا ناچ جہاں ایک طرف آقاؤں کی سخت گیریوں کو لمحہ بھر کیلئے بھلا دینے کا ایک بہانہ رہا ہے تو دوسری طرف اپنے تھکن سے چُور ٹوٹتے جسموں اور بھٹکتی روحوں کو جاری اور ساری رکھنے کا ایک ذریعہ بھی، یعنی قبائلی ناچ ان کی ٹوٹی پھوٹی روح کیلئے نفسیاتی مرہم کا کام کرتے۔ سندھ میں جہاں کہیں بھی شیدی مکرانی بستی کی صورت میں آباد ہیں وہاں تہواروں، شادی بیاہ اور دیگر موقعوں پر موگرمان ضرور بجاتے ہیں۔ (خورشید قائم خانی، "بھٹکتی نسلیں")

سیاہ فام بلوچ فنکاروں میں سے چند ایک نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر شہرت حاصل کی۔ بلاول بلیجیم (اصل نام محمد بلاول) نے ایک غیر روایتی ساز بینجو بجانے میں مہارت حاصل کی اور اس ساز پر سندھی اور بلوچی موسیقی میں شاندار جدتیں پیدا کیں۔ 1929 میں ایک مزدور گھرانے میں جنم لینے والے بلاول نے ریڈیو پاکستان سے اپنی فنکارانہ زندگی کا آغاز کیا اور اس کے بعد ٹیلی ویژن اور اسٹیج پر بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ پاکستان کے سرکاری طائفوں میں شامل ہو کر اس نے بہت سے ملکوں کا دورہ کیا۔ ابتدائی حوصلہ افزائی اسے اپنے ماں باپ سے حاصل ہوئی، اس کی ماں ماہگی ایک ممتاز مغنیہ اور باپ جھنک ایک ساز "کوزا نمک" بجانے کا ماہر تھا۔ بلاول نے ایک تخلیقی فنکار کے طور پر ایک قابلِ قدر ورثا چھوڑا ہے۔ اس کی جلد کی رنگت، گھونگھریالے بالوں اور موٹے ہونٹوں کے باعث اس کی افریقی اصل سے انکار ناممکن تھا۔ لیکن متعدد ایسے مخلوط النسل فنکار بھی موجود ہیں جو اپنے افریقی ورثے سے انکار کرتے ہیں۔

(ڈاکٹر فیروز احمد۔ "افریقہ۔ پاکستان کے ساحلوں پر")

Rs. 400